الرسالہ
Al-Risala

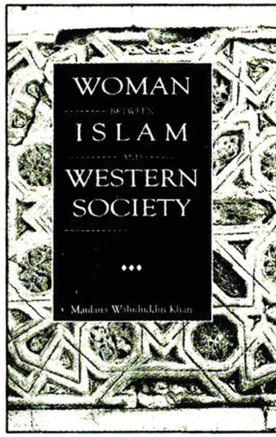
May 1996 • Issue 234 • Rs. 7

راستہ میں اگر پہاڑ آجائے تو اپنا سفر
جاری رکھنے کے لیے کوئی درّہ تلاش کیجیے۔



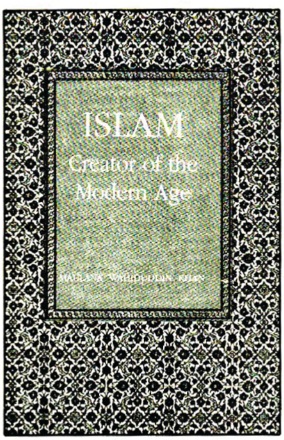
WOMAN BETWEEN ISLAM AND WESTERN SOCIETY

By Maulana Wahiduddin Khan



The status of woman in Islam is the same as that of man. Injunctions about honour and respect enjoined for one sex are enjoined equally for the other sex. So far as rights in this world and rewards in the Hereafter are concerned, there is no difference between the sexes. In the organization of daily living, both are equal participants and partners. Yet Islam sees man as man and woman as woman and, considering the natural differences, it advocates the principle of the division of labour between the two sexes rather than the equality of labour.

22 × 14.5 cm, 256 pages, ISBN 81-85063-75-3, Rs. 95



ISLAM: CREATOR OF THE MODERN AGE

By Maulana Wahiduddin Khan

Antiquity was an age of superstition: the present age is of science. Before reaching its present-day zenith, the modern, scientific age had to pass through three stages. The first was marked by the eradication of the superstitious mentality, the second saw the practical beginnings of scientific research; the third is the spectacular culmination of the scientific process in the second half of the twentieth century. The present volume examines the Islamic contribution to the completion of the first two stages during the millenium immediately followign upon the emergence of Islam.

22 × 14.5 cm, 125 pages, ISBN 81-85063-78-8, Rs. 65

دین انسانیت

اسلام کی اخلاقی اور انسانی تعلیمات

مولانا وحید الدّین خاں

فہرست

تمہید

لندن کی خاتون رائٹر کارین آرم اسٹرانگ نے مذہب پر ایک درجن سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں۔ان کی تقریباً تین سو صفحہ کی ایک کتاب سیرتِ رسولؐ پر ہے :

Muhammad: A Western Attempt to Understanding Islam
by Ms Karen Armstrong
Published by Victor Gollancz Ltd., London, 1992.

اس کتاب میں اسلام کا منصفانہ مطالعہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔خاص طور پر اس میں اس پروپگنڈے کو رد کیا گیا ہے کہ اسلام کوئی تشدد پسند مذہب ہے ،کتاب کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوتا ہے ——— محمدؐ ایک ایسے مذہب اور ایک ایسے کلچر کے بانی تھے ،جس کی بنیاد تلوار پر نہیں تھی۔مغربی افسانہ کے باوجود ،اسلام کا نام امن اور صلح کا مفہوم رکھنے والا ہے :

Muhammad... founded a religion and a cultural tradition that was not based on the sword — despite the Western myth — and whose name 'Islam' signifies peace and reconciliation. (p. 266)

جن لوگوں نے بھی منصفانہ انداز میں اسلام کا علمی مطالعہ کیا ہے ، ان سب نے اسلام کے بارہ میں اسی قسم کی رائے کا اظہار کیا ہے جس کی ایک مثال اوپر نقل کی گئی۔کسی مسلمان یا کسی مسلم گروہ میں عملی انحراف پایا جاسکتا ہے۔مگر جہاں تک اسلام کا تعلق ہے ،اس کا معاملہ یہی ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام کی تعلیمات تمام تر امن اور صلح اور انسانیت پر مبنی ہیں۔اسلام پورے معنی میں امن اور انسانیت کا مذہب ہے۔خالق کے معاملہ میں اس کا اصولی تصور توحید ہے ،اور مخلوق کے معاملہ میں اس کا اصولی تصور انسانیت۔

خدا اور انسان

ابومسعود انصاری مدینہ کے ایک مسلمان تھے۔ ایک روز وہ کسی بات پر اپنے غلام سے بگڑ گئے اور اس کو ڈنڈے سے مارنے لگے۔ عین اس وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ادھر سے گذر ہوا۔ آپ نے دیکھ کر فرمایا کہ اے ابومسعود، جان لو کہ خدا تمھارے اوپر اس سے زیادہ قابو رکھتا ہے جتنا تم اس غلام پر قابو رکھتے ہو (اعلم ابا مسعود للّٰہ اقدر علیك منك علیه) یہ سنتے ہی ابومسعود کے ہاتھ سے ڈنڈا چھوٹ کر گر گیا۔ اور انھوں نے کہا کہ آج سے یہ غلام آزاد ہے۔

ابومسعود پہلے معاملہ کو ایک انسان اور دوسرے انسان کا معاملہ سمجھتے تھے۔ اس وقت انھیں نظر آتا تھا کہ وہ مالک ہیں اور دوسرا آدمی غلام۔ اپنی ذات انھیں اونچی سطح پر نظر آئی اور غلام کی ذات نیچی سطح پر۔ مگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تنبیہ کے بعد انھیں نظر آیا کہ سارا معاملہ خدا کا معاملہ ہے۔ اب انھیں اپنا وجود بھی وہیں پڑا ہوا نظر آیا جہاں وہ اپنے غلام کو بٹھائے ہوئے تھے۔ دونوں یکساں طور پر خدا کے آگے عاجز نظر آئے۔ یہی وجہ تھی کہ اٹھا ہوا ڈنڈا ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔

حقیقت یہ ہے کہ سماجی زندگی کی تمام خرابیاں اسی لئے پیدا ہوتی ہیں کہ آدمی معاملہ کو انسان کی نسبت سے دیکھتا ہے نہ کہ خدا کی نسبت سے۔ ایک آدمی کو دولت مل جائے تو وہ ان لوگوں کے مقابلہ میں اپنے کو اونچا سمجھنے لگتا ہے جن کے پاس دولت نہیں۔ حالانکہ اگر وہ خدا کی نسبت سے دیکھے تو اس کو نظر آئے گا کہ وہ بھی اتنا ہی مفلس ہے جتنا کوئی دوسرا شخص۔ کسی آدمی کو بڑا عہدہ مل جائے تو وہ سمجھنے لگتا ہے کہ میں تمام لوگوں سے بڑا ہوں۔ حالانکہ اگر وہ خدا کی نسبت سے دیکھے تو وہ پائے گا کہ وہ بھی اتنا ہی حقیر ہے جتنا کہ دوسرے لوگ۔ ایک آدمی تیز ہے اور وہ دوسرے آدمی کے خلاف زبان چلا رہا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ اپنے مقابلہ میں وہ اس کو کمتر سمجھ رہا ہے۔ اگر وہ خدا کی نسبت سے دیکھے تو اس کے الفاظ کا ذخیرہ ختم ہو جائے کیوں کہ خدا کی نسبت سے وہ بھی اتنا ہی بے زور ہے جتنا کہ دوسرا آدمی۔

اسلام وہ انسان بناتا ہے جو معاملات کو ایک آدمی اور دوسرے آدمی کا معاملہ نہ سمجھے۔ بلکہ ہر معاملہ کو ایسا معاملہ سمجھے جو آخر کار خدا کے سامنے پیش ہونے والا ہے۔ یہ چیز تمام برائیوں کی جڑ کاٹ دیتی ہے۔ اس کے بعد کسی کے لیے گھمنڈ، حسد، جاہ پسندی اور بے انصافی کا موقع ہی باقی نہیں رہتا۔ اس کے بعد انسان کا "ڈنڈا" اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑتا ہے، بجائے اس کے کہ وہ کسی دوسرے آدمی کے سر کے اوپر پڑے۔

عبادت اور خدمت

اسلام کی عبادتیں اصلاً خدا کی یاد اور خدا کی پرستش کے لیے ہیں۔ تاہم ان کا نظام اس طرح بنایا گیا ہے کہ وہ انسانیت کی تعمیر کا ذریعہ بھی بن گئی ہیں۔ اہل اسلام ان عبادتوں کی ادائیگی کے دوران خدا کا حق ادا کرتے ہوئے بندوں کا حق ادا کرنے کی تربیت بھی حاصل کرتے رہتے ہیں۔

نماز خدا کے لیے ذکر و دعا کے ساتھ بندوں کے درمیان مساوات کا ذریعہ بھی بن گئی ہے۔ نماز باجماعت میں روزانہ پانچ بار تمام مسلمان ایک ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر مراسم عبادت ادا کرتے ہیں۔ چھوٹا اور بڑا، امیر اور غریب، بے اقتدار اور با اقتدار، عالم اور غیر عالم، سب کے سب ایک فرش پر اور ایک صف میں اس طرح کھڑے ہو جاتے ہیں کہ ایک اور دوسرے میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ اس طرح نماز کی عبادت عین اسی وقت مساوات انسانی کا عظیم سبق بھی بن گئی ہے۔

روزہ کے مہینہ میں ہر آدمی صبح سے شام تک مکمل طور پر بھوکا رہتا ہے۔ خواہ وہ کتنا ہی دولت مند ہو مگر روزہ میں اس کو بھی اسی طرح بھوکا رہنا ہے جس طرح کوئی عام آدمی۔ اس طرح روزہ رکھ کر ایک مسلمان جہاں خدا کی عبادت کرتا ہے وہیں وہ ضرورت مند انسانوں کی ضرورت کا بھی ذاتی تجربہ کرتا ہے۔ روزہ آدمی کو خدا کا عبادت گزار بنانے کے ساتھ انسانوں کا غم گسار بھی بنا دیتا ہے۔

زکوٰۃ کی نوعیت بھی واضح طور پر یہی ہے۔ زکوٰۃ کا اصل مقصد مالی عبادت ہے۔ زکوٰۃ میں آدمی یہ کرتا ہے کہ وہ خدا کے نام پر اپنی کمائی کا ایک حصہ نکال کر اسے غریبوں اور حاجت مندوں کو دیتا ہے۔ اس طرح زکوٰۃ بیک وقت خدا کی عبادت بھی ہے اور اسی کے ساتھ بندوں کی خدمت گزاری بھی۔ زکوٰۃ کی رقم نکال کر ایک طرف آدمی خدا کے معطی ہونے کا اعتراف کرتا ہے اور دوسری طرف بندوں کے سلسلہ میں وہ اپنی ذمہ داریوں کے احساس کو پختہ کرتا ہے۔

حج بھی اصلاً ایک عبادت ہے۔ مگر حج کے سفر میں حاجیوں کو لڑنے جھگڑنے سے روک دیا گیا ہے۔ حج میں طرح طرح کے لوگوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ لیکن حاجی اس احساس کے تحت لڑائی سے بچتا ہے کہ میرا حج کہیں باطل نہ ہو جائے۔ اس طرح حج خدا کی عبادت کے ساتھ بندوں کے درمیان پر امن زندگی گزارنے کی سالانہ تربیت بھی بن جاتا ہے۔

اچھا مسلمان

حضرت ابو ذر الغفاریؓ ایک مشہور صحابی ہیں۔ انھوں نے مدینہ کے پاس ربذہ میں ۳۲ھ میں وفات پائی۔ ان سے ایک طویل حدیث مروی ہے۔ اس حدیث کا ایک حصہ یہ ہے:

دخلت المسجد فاذا رسول اللّٰه صلے اللّٰه علیه وسلم جالس وحده فجلست الیه فقلت --- یا رسول اللّٰه ایّ المومنین افضل۔ قال احسنهم خلقا۔ قلت یا رسول اللّٰه فایّ المسلمین افضل قال من سلم الناس من لسانه و یده۔ قلت یا رسول اللّٰه فایّ الهجرة افضل قال من هجر السیئات۔

(تفسیر ابن کثیر ۱/۵۸۶)

میں مسجد میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تنہا بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں آپ کے پاس بیٹھ گیا۔ پھر میں نے کہا کہ اے خدا کے رسول ہومنوں میں سب سے زیادہ افضل کون ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جس کا اخلاق سب سے اچھا ہو۔ پھر میں نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول، سب سے افضل مسلم کون ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جس کی زبان اور جس کے ہاتھ سے لوگ محفوظ ہوں۔ پھر میں نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول، سب سے افضل ہجرت کون سی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس شخص کی ہجرت جو برائیوں کو چھوڑ دے۔

اس حدیث رسول سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام جو انسان بنانا چاہتا ہے وہ کیسا انسان ہوتا ہے۔ یہ وہ انسان ہے جو لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں بہترین اخلاق کا ثبوت دے۔ یہ وہ انسان ہے جس کے اندر ذمہ داری کا احساس اس طرح جاگ اٹھے کہ وہ اپنی زبان سے کسی کا دل نہ دکھائے، اس کے ہاتھ سے کسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ وہ ہر اس عادت اور ہر اس روش کو چھوڑ دے جس میں برائی کا کوئی پہلو موجود ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ اچھا مسلمان وہ ہے جو اچھا انسان ہو۔ اسلام دراصل انسان سازی کا مذہب ہے۔ اسلام کا مقصد انسان کی فکری تطہیر اور عملی اصلاح ہے، جس آدمی کے دل میں اسلام اتر جائے وہ اپنے آپ اچھا انسان بھی بن جائے گا۔

جس آدمی کی زندگی بھلائی سے خالی ہو اس کی زندگی یقیناً اسلام سے بھی خالی ہوگی۔

والدین کے ساتھ

قرآن (العنکبوت ۸) میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اور ہم نے انسان کو تاکید کی کہ وہ اپنے باپ اور ماں کے ساتھ نیک سلوک کرے (وَ وصَّینا الانسانَ بوالدیہ حُسنا) قرآن میں کئی مقامات پر اس طرح کی آیتیں ہیں جن میں یہ تاکیدی حکم دیا گیا ہے کہ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ بہتر سے بہتر سلوک کرے۔ ان کے تمام حقوق ادا کرے۔ حتیٰ کہ اگر وہ اپنی اولاد کو جھڑکیں تب بھی اولاد کو چاہیے کہ وہ ان کی سخت کلامی کا برا اثر نہ لے اور ان کی محبت اور خدمت میں کوئی کمی ہرگز نہ کرے۔ وہ یک طرفہ طور پر ان کے ساتھ حسن سلوک کا پابند رہے۔

حدیث میں ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اس نے کہا کہ اے خدا کے رسولؐ، میرے لیے حسن صحبت کا تمام لوگوں میں سب سے زیادہ حق دار کون ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تمہاری ماں۔ اس نے کہا کہ اس کے بعد کون۔ آپ نے فرمایا کہ تمہاری ماں۔ اس نے کہا کہ اس کے بعد کون۔ آپ نے فرمایا کہ تمہاری ماں۔ اس نے کہا کہ اس کے بعد کون۔ آپ نے فرمایا کہ پھر تمہارا باپ (جاء رجل الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال۔ من احقُّ الناس بحسن صحابتی۔ قال امك۔ قال ثم من۔ قال ثم امك۔ قال ثم من۔ قال ثم امك۔ قال ثم من۔ قال ثم ابوك) صحیح مسلم بشرح النووی ۱۶/۱۰۲

اس طرح کی بہت سی حدیثیں ہیں جو بتاتی ہیں کہ خدا کے بعد انسان کے اوپر سب سے زیادہ حق ماں اور باپ کا ہے۔ اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ کسی انسان پر اس دنیا میں سب سے زیادہ احسان ماں اور باپ کا ہوتا ہے۔ اس لیے ہر انسان پر لازم ہے کہ بڑا ہونے کے بعد وہ ہر طرح اپنے والدین کی خدمت کرے۔ وہ ان کے بڑھاپے میں اسی طرح ان کے کام آئے جس طرح اس کے بچپن میں اس کے والدین اس کے کام آئے تھے۔

دوسرا پہلو یہ کہ آدمی اپنے ماں باپ کی خدمت کر کے اپنے آپ کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ وسیع تر انسانیت کا خدمت گزار بن سکے۔ وہ تمام انسانوں کو محبت کی نظر سے دیکھے۔ وہ تمام انسانوں کی عزت کرنا سیکھے۔ وہ تمام انسانوں کے حقوق ادا کرنے والا بن جائے۔

عمل صالح

قرآن میں بار بار عمل صالح کا حکم دیا گیا ہے۔ مثلاً سورہ النحل (آیت ۹۷) میں فرمایا کہ جو شخص صالح عمل کرے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت تو ہم اس کو زندگی دیں گے، ایک اچھی زندگی۔ اور جو کچھ وہ کرتے رہے اس کا ہم ان کو بہترین بدلہ دیں گے (مَنْ عَمِلَ صالحاً مِن ذکرٍ او اُنثیٰ و ھُو مؤمِنٌ فلنُحْیِینّہ حیاۃً طیبۃً و لنجزِ ینّھم اَجْرَھُم باحْسن ما کانوا یعْملون)

صالح کا مطلب ہے درست، نیک، ٹھیک۔ عربی میں کہا جاتا ہے ھُوصالحٌ بکذا۔ یعنی اس کے اندر یہ صلاحیت ہے کہ فلاں کام کو عمدگی کے ساتھ کر سکے۔ صلح فی عملہ کا مطلب ہوتا ہے کام میں درست ہونا۔ صلاح دراصل فساد کا ضد ہے۔ ہر عمل جو غلط ہو وہ عملِ فاسد ہے۔ اسی طرح ہر عمل جو صحیح اور درست ہو وہ عملِ صالح ہے۔

عملِ صالح کا تعلق انسانی زندگی کے تمام معاملات سے ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ آدمی لوگوں کے ساتھ موجودہ دنیا میں اس طرح رہے کہ اس کا ہر عمل صالح عمل ہو۔ گھر سے لے کر باہر تک اس کا کوئی بھی عمل صالح روش سے ہٹا ہوا نہ ہو۔ اس اعتبار سے پوری شریعت عمل صالح کی شریعت ہے۔ شریعت اسلامی کے تمام احکام دراصل یہ بتانے کے لیے ہیں کہ کس معاملے میں کون سی روش صالح روش ہے، اور کون سی روش صالح روش نہیں۔

مثلاً سچ صالح قول ہے اور جھوٹ غیر صالح قول۔ انصاف صالح عمل ہے اور ظلم غیر صالح عمل۔ محبت صالح کیفیت ہے اور نفرت غیر صالح کیفیت۔ امن صالح حالت ہے اور بدامنی غیر صالح حالت۔ خیر خواہی صالح جذبہ ہے اور بدخواہی غیر صالح جذبہ۔ امانت داری صالح فعل ہے اور خیانت غیر صالح فعل۔ حقوق کی ادائگی صالح روش ہے اور حق تلفی غیر صالح روش۔ وغیرہ۔

خدا کا پسندیدہ عمل وہی ہے جو صالح عمل ہو، ایسے ہی لوگوں کے لیے خدا کا انعام ہے۔ جو عمل غیر صالح ہو وہ خدا کا مقبول اور پسندیدہ عمل نہیں۔ اس دنیا میں صرف صالح بیج اگتا ہے اور سرسبز و شاداب ہوتا ہے۔ اسی طرح اس دنیا میں صرف صالح انسان ترقی کرتا ہے۔ غیر صالح انسان کے لیے خدا کی اس دنیا میں نہ کوئی ترقی ہے اور نہ کوئی کامیابی۔

جامع اصول

دینِ انسانیت کا نہایت سادہ اصول یہ ہے کہ ——— دوسروں کے ساتھ وہی سلوک کرو جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو۔ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک اس کا یہ حال نہ ہو جائے کہ وہ اپنے بھائی کے لیے وہی پسند کرے جو وہ خود اپنے لیے پسند کرتا ہے (لا یؤمن احدکم حتی یحبّ لاخیہ مایحبُّ لنفسہ) فتح الباری بشرح صحیح البخاری ۱/۳۰

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ حدیث کی تمام کتابوں میں آیا ہے۔ مثلاً مسلم کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: والذی نفسی بیدہ لا یؤمن عبدٌ حتی یحبّ لجارہ او قال لاخیہ مایحب لنفسہ (صحیح مسلم بشرح النووی ۲/۱۷) یعنی اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، کوئی بندہ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے پڑوسی (یا اپنے بھائی) کے لیے وہی پسند نہ کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

کوئی آدمی خواہ پڑھا لکھا ہو یا بے پڑھا لکھا ہو، ایک طبقہ سے تعلق رکھتا ہو یا دوسرے طبقہ سے، حتی کہ معذور ہو یا غیر معذور، ہر حال میں وہ یقینی طور پر یہ جانتا ہے کہ کیا چیز مجھے پسند آتی ہے اور کیا چیز مجھے پسند نہیں آتی۔ اب ہر آدمی سادہ طور پر اپنے لیے یہ اصول بنا لے کہ جو سلوک اس کو پسند آتا ہے وہی سلوک وہ دوسروں کے ساتھ کرے۔ اور جو سلوک اس کو پسند نہیں آتا اس سے وہ خود بھی پرہیز کرنے لگے۔

یہ ایک ایسا جامع اصول ہے جو عورت اور مرد، فرد اور قوم، ملکی اور غیر ملکی ہر ایک کے لیے کارآمد ہے۔ لوگ اگر اس اصول کو اختیار کر لیں تو خاندانی زندگی بھی بہتر ہو جائے اور سماجی زندگی بھی۔ قومی زندگی بھی خوش اسلوبی کے ساتھ چلنے لگے اور بین اقوامی زندگی بھی۔ یہ گویا انسانی اخلاقیات کے لیے ایک شاہ کلید ہے۔ یہ ایک ہی کنجی تمام تالوں کو کھول دینے کے لیے کافی ہے۔

جو آدمی اپنے اور غیر میں فرق نہ کرے وہ ایک با اصول انسان ہوگا۔ اس کے اندر ایک بے تضاد شخصیت پرورش پائے گی۔ اس کی یہ صفت اس کو کامل انسان بنا دے گی۔

صبر کی تعلیم

ایک مغربی مبصر ولیم پیٹن (William Paton) نے لکھا ہے کہ اسلام کا ایک پھل انسانیت کے لیے یہ رہا ہے کہ اس نے لوگوں میں شدید اور مستقل صبر پیدا کیا۔ صبر کی یہ کیفیت ان میں اللہ کی کامل اطاعت سے پیدا ہوئی :

One of the fruits of Islam has been that stubborn, durable patience which comes of the submission to the absolute will of Allah

یہ تبصرہ نہایت درست ہے۔ اسلام میں صبر کی بے حد اہمیت ہے۔ قرآن کی بیشتر آیتیں، براہ راست یا بالواسطہ طور پر، صبر ہی سے متعلق ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ صبر کی صفت ایک ایسی صفت ہے جس کے بغیر ایمان و اسلام کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔

موجودہ دنیا اس ڈھنگ پر بنی ہے کہ یہاں بار بار آدمی کو ناخوشگوار تجربات سے سابقہ پیش آتا ہے، گھر کے اندر بھی اور گھر کے باہر بھی۔ اب اگر آدمی ہر ایسے موقع پر لوگوں سے الجھ جائے تو وہ انسانی ترقی کی طرف زیادہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اس لیے اسلام میں صبر کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ تاکہ آدمی ناخوش گواریوں کو نظر انداز کرتے ہوئے مقصد اعلیٰ کی طرف اپنے سفر کو جاری رکھ سکے۔

قرآن میں بار بار صبر کی تاکید کی گئی ہے۔ مثلاً فرمایا کہ جو مصیبتیں تمہارے اوپر پڑیں ان پر صبر کرو (لقمان ۱۷) صبر کرو، اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے (الانفال ۴۶) فرمایا کہ گھاٹے سے محفوظ رہنے والے لوگ وہ ہیں جو ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کریں اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کریں (العصر ۳)

اسی طرح حدیث میں کثرت سے صبر کی اہمیت بتائی گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسمعوا و اطیعوا و اصبروا (مسند احمد) یعنی سنو اور مانو اور صبر کرو۔ آپؐ نے فرمایا : امر اللہ بالصبر والعفو (ابو داؤد، کتاب الامارۃ) یعنی اللہ نے صبر اور عفو و درگزر کا حکم دیا ہے۔ ایک صحابی کہتے ہیں : کان النبی واصحابہ یصبرون علی الاذی (البخاری، کتاب التفسیر) یعنی رسولؐ اور اصحاب رسول ہمیشہ ایذاؤں پر صبر کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ صبر اسلامی عمل کی بنیاد ہے۔ فتنوں اور آزمائشوں کی اس دنیا میں صبر کے بغیر کوئی آدمی اسلامی کردار پر قائم نہیں رہ سکتا۔

روحانی ترقی

اسلام کا اصل نشانہ روحانی ترقی ہے۔ انسان کی روحانیت جاگے، انسان کے اندر چھپی ہوئی ربانیت بیدار ہو، یہ اسلام کا اصل مقصود ہے۔ قرآن میں اس کو تطہیر اور تزکیہ (التوبہ ۱۰۲) کہا گیا ہے۔

اصل یہ ہے کہ ہر انسان پیدائش سے فطرتِ صحیح لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے ہر انسان اپنی ابتدائی شخصیت کے اعتبار سے پاک صاف ہی ہوتا ہے۔ مگر دنیا میں زندگی گزارتے ہوئے اس پر خارجی غبار چھا جاتے ہیں۔ اس خارجی غبار سے پاک کرنا اور اپنے آپ کو دوبارہ اپنی فطری حالت پر لے جانا، یہی تطہیر اور تزکیہ ہے۔

تطہیر اور تزکیہ کا یہ عمل آدمی کو خود کرنا پڑتا ہے۔ ایک چھوٹا بچہ اپنے آپ ہی طاہر اور پاک ہوتا ہے۔ مگر اس کی یہ حالت کسی ذاتی کوشش کی بنا پر نہیں ہوتی، بلکہ فطرت کی تخلیق کی بنا پر ہوتی ہے۔ بڑا ہونے کے بعد جب آدمی اپنے آپ کو روحانی اعتبار سے طاہر اور پاک صاف بناتا ہے تو یہ اس کا اپنا عمل ہوتا ہے۔ یہ شعوری طور پر خود اپنے ارادہ اور اپنی کوشش سے اپنے آپ کو روحانی ترقی کے درجہ تک پہنچانا ہے۔ یہی خود حاصل کردہ روحانی ترقی وہ اصل چیز ہے جو اسلام میں مطلوب ہے۔ اسی کو قرآن میں قلب سلیم کہا گیا ہے (الشعراء ۸۹)

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرماتے ہوئے کہا: اللّٰھُمَّ اجعلْ فی قلبی نوراً (البخاری، کتاب الدعوات) یعنی اے اللہ، میرے دل میں نور ڈال دے۔ اسی طرح آپ نے ایک شخص کے بارہ میں دعا کرتے ہوئے فرمایا: اللّٰھم اغفر ذنبہ وطہّر قلبہ (مسند احمد) یعنی اے اللہ، اس کے گناہ کو بخش دے، اور اس کے قلب کو پاک کر دے۔ اسی طرح موطا الامام مالک میں حضرت لقمان کا ایک قول اس طرح نقل کیا گیا ہے کہ اللہ دل کو حکمت کے نور سے اسی طرح زندہ کرتا ہے جس طرح وہ مُردہ زمین کو بارش سے زندہ کرتا ہے (ان اللّٰہ یُحیی القلوبَ بنورِ الحکمۃِ کما یُحیی اللّٰہُ الارضَ المیتۃَ بوابلِ السماء (صفحہ ۷۰۰)

یہی روحانی ترقی ہے، اور روحانی ترقی ہی اسلام کا اصل مقصود ہے۔ جو آدمی روحانی ترقی سے محروم ہو وہ یقینی طور پر اسلام سے بھی محروم ہوگا۔

اعلیٰ اخلاق

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے جس اخلاق کی تعلیم دی تھی اور جس کو آپ نے اپنی زندگی میں پوری طرح اپنا لیا، اس کا تذکرہ قرآن میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے ——— اور بے شک تم ایک اعلیٰ اخلاق پر ہو (وانک لعلیٰ خلق عظیم) القلم ۴

اس کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر اسلام نہ صرف اخلاق پر تھے بلکہ وہ اعلیٰ اخلاق کا نمونہ تھے، اخلاق اگر سادہ قسم کے اخلاق کا نام ہے تو اعلیٰ اخلاق سے مراد وہ اخلاق ہے جب کہ آدمی دوسروں کے رویہ سے بلند ہو کر عمل کرے۔ اس کا طریقہ یہ نہ ہو کہ برائی کرنے والوں کے ساتھ برائی اور بھلائی کرنے والوں کے ساتھ بھلائی۔ بلکہ وہ ہر ایک کے ساتھ بھلائی کرے، خواہ دوسرے اس کے ساتھ برائی ہی کیوں نہ کر رہے ہوں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اخلاق کے اسی اعلیٰ معیار پر تھے۔ اس طرح آپ نے خود نمونہ بن کر لوگوں کو عملی طور پر بتایا کہ وہ کس طرح اپنی زندگی کو حقیقی معنوں میں با اخلاق بنائیں۔ اس قسم کا کردار کسی شخص کے بارہ میں یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ ایک با اصول انسان ہے۔ ایسے آدمی کی شخصیت حالات کی پیداوار نہیں ہوتی بلکہ خود اپنے اعلیٰ اصولوں کی پیداوار ہوتی ہے۔ ایسا اخلاق کسی آدمی کے بارہ میں اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ وہ سچا انسان ہے، وہ فطرت کے راستہ پر قائم ہے۔

حدیث میں کثرت سے حسن اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے۔ ایک حدیث میں آپ نے فرمایا کہ میں اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ اچھے اخلاق کی تکمیل کروں (بُعثت لأُتمم مکارم الاخلاق) اسی طرح آپ نے فرمایا کہ سب سے زیادہ کامل ایمان اس کا ہے جس کا اخلاق سب سے زیادہ اچھا ہو (اکمل المؤمنین ایمانًا احسنهم خلقًا) آپ نے فرمایا کہ قیامت کے دن میزان میں سب سے افضل چیز اچھا اخلاق ہوگا (ان افضلَ شيئٍ فی المیزان الخلقُ الحسن)

مومن خدائی بلندیوں میں جینے والا انسان ہوتا ہے۔ اس لیے ہر حال میں وہ ایک بلند کردار انسان بنا رہتا ہے۔ اس کی بلند فکری کسی حال میں ختم نہیں ہوتی، کوئی بھی صورت حال اس کی بلند کرداری کو ختم کرنے والی ثابت نہیں ہوتی۔

اچھا گمان کرنا

مدینہ میں ایک بار ایک معاملہ میں باہمی بدگمانی کا واقعہ پیش آیا، اس موقع پر قرآن میں یہ حکم اترا کہ جب تم لوگوں نے اس بات کو سنا تو مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں نے ایک دوسرے کی بابت نیک گمان کیوں نہیں کیا، اور کیوں نہ کہا کہ یہ تو کھلا ہوا بہتان ہے (النور ۱۲)

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام چاہتا ہے کہ معاشرہ کے اندر خوش گمانی کی فضا ہو۔ لوگ کسی کے خلاف کوئی بات سنیں تو نہ صرف یہ کہ اس کو بیان نہ کریں بلکہ دل میں بھی اس پر یقین نہ کریں۔ وہ اپنے ذہن کو ہمیشہ اچھے خیالات سے آباد کریں۔

قرآن کی ایک اور آیت میں فرمایا کہ تم لوگ بہت سے گمانوں سے بچو، کیونکہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں (الحجرات ۱۲) سماج میں اختلاف اور تفریق کی برائیاں ہمیشہ کسی بدگمانی سے شروع ہوتی ہیں۔ اگر بدگمانی کو شروع ہی میں ختم کر دیا جائے تو باہمی تعلقات بگڑنے کی نوبت ہی نہ آئے۔ اور سماج کے اندر خوشگوار انسانی ماحول مسلسل باقی رہے۔ گمان سے بچنا گویا فتنہ کو اس کے آغاز ہی میں کچل دینا ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (ایاکم والظن فان الظن اکذب الحدیث (صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والآداب) یعنی تم لوگ بدگمانی سے بچو، کیوں کہ بدگمانی سب سے زیادہ جھوٹی بات ہے۔

اس طرح کی بہت سی حدیثیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بارہ میں اسلام کا حکم اور اس کا تقاضا کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے بارہ میں اپنے دل کو صاف رکھیں۔ اگر کسی کے بارہ میں کوئی غلط بات کہی جائے تو محض سننے کی بنیاد پر ہرگز اس کو نہ مانیں۔ یا تو اس کو خوش گمانی پر محمول کرتے ہوئے اپنے ذہن سے نکال دیں۔ اور اگر کسی وجہ سے اس کے بارہ میں کوئی رائے قائم کرنا ضروری ہو تو معاملہ کی پوری تحقیق کریں۔ مکمل تحقیق کے بغیر نہ کوئی رائے بنائیں اور نہ اس کی بنیاد پر کوئی اقدام کریں۔

اسلام کا مطلوب انسان وہ ہے جو دوسروں کے بارہ میں اچھی رائے رکھے۔ جس کا سینہ دوسروں کے بارہ میں خوش گمانیوں سے بھرا ہوا ہو۔

تواضع

اسلام کی ایک تعلیم تواضع ہے۔ قرآن میں سورہ لقمان میں فرمایا کہ لوگوں سے بے رخی نہ کرو اور زمین میں اکڑکر نہ چلو۔ بے شک اللہ کسی اکڑنے والے اور فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔ اور اپنی چال میں میانہ روی اختیار کرو اور اپنی آواز کو پست رکھو۔ بے شک سب سے بری آواز گدھے کی آواز ہے (لقمان ۱۸-۱۹)

انسان کا حسن اکڑنے میں نہیں ہے بلکہ جھکنے میں ہے۔ انسان کو فخر زیب نہیں دیتا بلکہ تواضع کی روش اسے زیب دیتی ہے۔ انسان کا کمال یہ نہیں ہے کہ وہ شور والی آوازیں نکالے، انسان کا کمال یہ ہے کہ اس کی بول میں نرمی کی صفت پیدا ہو جائے۔ اکڑ کا انداز غیر سنجیدگی کی علامت ہے۔ اسلام آدمی کو آخری حد تک سنجیدہ بناتا ہے۔ اس لیے ایک شخص جب پورے معنی میں مسلم بنتا ہے تو وہ پورے معنی میں متواضع بھی بن جاتا ہے۔ تواضع خلاصۂ انسانیت ہے، اور اسی کے ساتھ وہ خلاصۂ اسلام بھی ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ اَوحیٰ اِلَیَّ اَن تواضعوا حتی لا یبغی احد علی احد ولا یفخرُ احدٌ علی احدٍ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے میری طرف یہ وحی بھیجی کہ تم لوگ تواضع کی روش اختیار کرو، یہاں تک کہ کوئی شخص کسی کے اوپر درازدستی نہ کرے، کوئی شخص کسی کے اوپر فخر نہ کرے (سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی التواضع)

اسلام یہ تصور دیتا ہے کہ بڑا صرف ایک خدا ہے، اس کے سوا جو انسان ہیں وہ سب کے سب یکساں طور پر اس کے بندے ہیں۔ یہ عقیدہ جب صحیح طور پر دلوں میں بیٹھ جاتا ہے تو وہ اپنے آپ تواضع کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ خدا کو اپنا بڑا بنانے والے انسان کے اندر جو صفت پیدا ہوتی ہے، اس کا دوسرا نام تواضع ہے۔

تواضع انسانیت کا زیور ہے۔ جس سماج کے افراد میں تواضع کی صفت ہو، اس سماج میں دوسری تمام خوبیاں اپنے آپ پیدا ہو جائیں گی۔ تواضع والا آدمی اپنی فطرت پر ہوتا ہے اور غیر متواضع آدمی اپنی فطرت سے ہٹ جاتا ہے، تواضع آدمی کو حقیقت پسند بناتی ہے۔ جس آدمی کے اندر تواضع نہ ہو اس کے اندر حقیقت پسندی بھی نہیں ہوگی۔ وہ بظاہر انسان ہوگا مگر حقیقۃً غیر انسان۔

نرمی کا انداز

اسلام کی تعلیمات کو اپنانے کے بعد آدمی کے اندر جو مزاج بنتا ہے وہ نرمی اور رفق کا مزاج ہے۔ اسلام میں وہ اس حقیقت کو دریافت کرتا ہے کہ خدا بڑا ہے (اللہ اکبر) یہ دریافت اس کو بتاتی ہے کہ بڑائی تو صرف خدا کے لیے ہے، میرے لیے بڑائی نہیں۔ اس طرح اپنے آپ اس کے اندر انکسار اور فروتنی کا مزاج پیدا ہو جاتا ہے۔

تاہم نرمی کے سلوک پر قائم رہنے کی لازمی شرط یہ ہے کہ آدمی کے اندر بے پناہ حد تک برداشت کا مزاج ہو۔ موجودہ دنیا میں بار بار دوسروں کی طرف سے ناخوش گواری کا تجربہ ہوتا ہے۔ اس لیے نرمی کے سلوک پر وہی شخص قائم رہ سکتا ہے جو ردعمل کی نفسیات سے اپنے آپ کو بچا سکے۔ اسی لیے قرآن میں خدا پرست انسان کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ ــــــ غصہ کو پی جانے والے اور لوگوں کو معاف کرنے والے (والکاظمین الغیظ والعافین عن الناس) آل عمران ۱۳۴

بخاری اور مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نرم ہے اور ہر معاملہ میں نرمی کو پسند کرتا ہے (ان اللہ رفیق یحب الرفق فی الامر کلہ) اسی طرح آپ نے فرمایا: ان اللہ رفیق یحب الرفق ویعطی علی الرفق ما لا یعطی علی العنف وما لا یعطی علی ما سواہ (صحیح مسلم) یعنی اللہ نرم ہے اور نرمی کو پسند کرتا ہے۔ وہ نرمی پر وہ چیز دیتا ہے جو سختی پر نہیں دیتا اور نہ کسی دوسری چیز پر۔ اسی طرح ایک اور حدیث میں ہے کہ: مَن یُحرَم الرفق یُحرَم الخیر کلہ (صحیح مسلم) یعنی جو شخص نرمی سے محروم ہو وہ تمام بھلائیوں سے محروم ہو جائے گا۔

اگر آپ لوگوں سے معاملہ کرتے ہوئے اکڑ سے کام لیں تو آپ لوگوں کی انا کو جگائیں گے۔ اس طرح مسئلہ بڑھے گا۔ پہلے اگر آپ کو کڑوے بول سے سابقہ پیش آیا تھا تو اب آپ لوگوں کے پتھر کو سہنے کے لیے مجبور کر دیے جائیں گے۔ اس کے بجائے اگر آپ معاملات میں نرمی والا طریقہ اختیار کریں تو آپ کا یہ سلوک لوگوں کے ضمیر کو جگائے گا۔ اب معاملہ برعکس ہوگا۔ پہلے اگر کوئی شخص آپ کا مخالف بنا ہوا تھا تو اب وہ مخالفت کو بھول کر آپ کا قریبی دوست بن جائے گا۔ نرمی کامیاب انسان کی صفت ہے اور اکڑ ناکامیاب انسان کی صفت۔

قناعت

انسان کی ایک اہم اخلاقی صفت وہ ہے جس کو قناعت کہا جاتا ہے۔ بہتر سماج کی تعمیر کے لیے ضروری ہے کہ افراد کے اندر قناعت کا مزاج موجود ہو۔ جس سماج کے افراد میں قناعت کا مزاج پایا جائے اس سماج میں ایک دوسرے کے درمیان محبت کی فضا ہوگی۔ اور جس سماج کے افراد میں یہ مزاج نہ پایا جائے وہ یقینی طور پر باہمی محبت کی فضا سے خالی ہوگا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس شخص نے فلاح پائی جس نے اسلام کو قبول کیا اور جس کو بقدر ضرورت رزق دیا گیا۔ اور وہ اللہ کے دیے پر قانع ہوگیا (قد افلح من اسلم و رُزق کفافاً و قنّعہ اللّٰہ بما آتاہ) صحیح مسلم بشرح النووی ۱۴۵/۷

موجودہ دنیا میں کسی انسان کی سب سے بڑی خوش نصیبی یہ ہے کہ وہ اپنے رب کا شاکر بندہ بن کر رہ سکے، اور حقیقی معنوں میں شاکر بندہ وہی بن سکتا ہے جس میں قناعت کا مزاج پایا جائے۔ چنانچہ حدیث (ابن ماجہ، کتاب الزہد) میں یہ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وکُن قَنِعاً تکن اَشکر الناس (تم قانع بن جاؤ اور پھر تم سب سے زیادہ شکر کرنے والے بن جاؤ گے)

قناعت کی روش اختیار کرنے سے آدمی کو قلبی سکون حاصل ہوتا ہے۔ اور قناعت نہ کرنے سے حرص کا مزاج بنتا ہے۔ اور جس آدمی کے اندر حرص کا مزاج آجائے وہ کبھی اور کسی حال میں مطمئن نہیں ہوسکتا۔ وہ ہر حال میں کمی کا شکوہ کرتا رہے گا۔

قناعت آدمی کو ذہنی اطمینان دیتی ہے اور حرص سے آدمی کے اندر ذہنی پراگندگی پیدا ہوتی ہے۔ قناعت فکری بلندی کی طرف لے جاتی ہے اور حرص فکری پستی کی طرف۔ قناعت آدمی کو دوسروں سے محبت کرنے والا بناتی ہے اور حرص دوسروں سے نفرت کرنے والا۔ قناعت روحانی ترقی کا ذریعہ ہے اور حرص روحانی پستی کا ذریعہ۔

قناعت کا مزاج آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ ادنی باتوں سے اوپر اٹھ کر اعلیٰ حقیقتوں میں جی سکے۔ وہ سادہ زندگی اور اونچی سوچ والا انسان بن جائے۔

ایثار

قرآن میں اہل ایمان کی جو صفات بتائی گئی ہیں ان میں سے ایک صفت دوسرے کے مفاد کے لیے اپنے مفاد کو قربان کرنا ہے۔ یعنی اپنی ضرورت پر دوسرے کی ضرورت کو مقدم سمجھنا۔ خود زحمت اٹھاکر دوسرے کی مدد کرنا۔ اپنی ذات پر دوسرے کی ذات کو ترجیح (preference) دینا۔ اس انسانی صفت کے لیے قرآنی لفظ ایثار ہے۔

ہجرت کے بعد اچانک بہت سے لوگ مکہ سے مدینہ آگئے۔ یہ لوگ بظاہر مدینہ والوں کے اوپر بوجھ تھے۔ کیوں کہ مہاجرین اس وقت بالکل خالی ہاتھ تھے۔ اور مقامی باشندوں (انصار) کے پاس مکان، زمین، باغ وغیرہ تھے۔ مگر اہل مدینہ نے انتہائی خوش دلی کے ساتھ ان نو وار دین کا استقبال کیا جو بظاہر ان کی معیشت پر بوجھ بن کر آئے تھے۔ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے قرآن میں فرمایا :

اور جو لوگ پہلے سے مدینہ میں قرار پکڑے ہوئے ہیں اور ایمان استوار کیے ہوئے ہیں، جو ان کے پاس ہجرت کرکے آتا ہے اس سے وہ محبت کرتے ہیں اور وہ اپنے دلوں میں اس سے تنگی نہیں پاتے جو مہاجرین کو دیا جاتا ہے۔ اور وہ ان کو اپنے اوپر مقدم رکھتے ہیں (ایثار کا معاملہ کرتے ہیں) اگرچہ ان کے اوپر فاقہ ہو۔ اور جو اپنے جی کے لالچ سے بچا لیا گیا تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں (الحشر ۹)

یہ ایثار ایک اعلیٰ انسانی صفت ہے۔ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جو ہر روز ہر آدمی کے ساتھ پیش آتا ہے۔ ہر صبح و شام یہ موقع سامنے آتا ہے جبکہ ایک آدمی محسوس کرتا ہے کہ اسے اپنے آپ کو پیچھے کرکے دوسرے کو آگے بڑھنے کا راستہ دینا چاہیے۔ خود تکلیف اٹھاکر دوسرے کو آرام پہنچانا چاہیے۔ اپنے اخراجات میں کمی کرکے دوسرے کی مدد کرنا چاہیے۔ اپنے وقت کا ایک حصہ نکال کر اس کو دوسرے کی خدمت میں لگانا چاہیے۔ اپنی ذات کو حذف کرکے دوسرے کو اوپر اٹھانا چاہیے۔ خود چپ ہوکر دوسرے کو بولنے کا موقع دینا چاہیے۔ سڑک پر اپنی گاڑی کنارے کرکے دوسرے کو گنجائش دینا چاہیے کہ وہ اپنی منزل کی طرف جاسکے۔

اسی ذاتی قربانی (self-sacrifice) کا نام ایثار ہے۔ یہ ایک اعلیٰ انسانی صفت ہے۔ قرآن کے مطابق، وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں جن کے اندر یہ انسانی صفت پائی جاتی ہو۔

مہربانی کا سلوک

قرآن میں خدا کی صفت الرحمٰن اور الرحیم بتائی گئی ہے۔ یعنی بہت زیادہ مہربان، نہایت رحم والا۔ اسی طرح پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمۃ للعالمین (الانبیاء ۱۰۷) کہا گیا ہے۔ یعنی آپ ساری دنیا کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ آپ کی سب سے زیادہ نمایاں صفت آپ کا آفاقی رحمت کا حامل ہونا ہے۔

قرآن میں انسان کو یہ خدائی ہدایت دی گئی ہے کہ وہ ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کریں اور ایک دوسرے کو ہمدردی کی نصیحت کریں (وتواصوا بالصبر وتواصوا بالمرحمۃ) اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان دوسرے انسان کے ساتھ شفقت اور ہمدردی اور مہربانی کا سلوک کرے، حتیٰ کہ اگر دوسروں کی طرف سے زیادتی کا تجربہ ہو تب بھی اس کو برداشت کرتے ہوئے اپنا ہمدردانہ رویہ بدستور پوری طرح باقی رکھے۔ القرطبی نے وتواصوا بالمرحمۃ کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ خلق خدا کے ساتھ رحمت کا معاملہ کیا جائے (ای بالرحمۃ علی الخلق)

اس سلسلہ میں کثرت سے روایتیں حدیث کی کتابوں میں آئی ہیں۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الراحمون یرحمهم الرحمٰن۔ یعنی رحم کرنے والوں پر خدائے رحمٰن رحم فرمائے گا۔ اسی طرح آپ نے فرمایا: ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء۔ یعنی تم زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تمہارے اوپر رحم کرے گا۔ ایک اور حدیث کے الفاظ یہ ہیں: انما یرحم اللہ من عبادہ الرحماء۔ یعنی اللہ اپنے بندوں میں ان پر رحم کرے گا جو دوسروں پر رحم کرتے ہیں (تفسیر ابن کثیر ۴/۵۱۴)

اسلام کی یہ تعلیم اتنی زیادہ پھیلی کہ وہ پوری دنیا کے مسلم لٹریچر میں شامل ہو گئی۔ ہر زبان میں اس کی گونج سنائی دینے لگی۔ ہندستان کے ایک مسلم شاعر نے کہا:

کرو مہربانی تم اہل زمیں پر　　خدا مہرباں ہوگا عرش بریں پر

اس معاملہ کی اہمیت اسلام میں اتنی زیادہ ہے کہ اس کو انتہائی ذاتی مسئلہ کی حیثیت دے دی گئی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا یرحم اللہ من لا یرحم الناس۔ یعنی اللہ اس انسان پر مہربانی نہیں کرے گا جو دوسرے لوگوں پر مہربانی نہ کرے (صحیح البخاری، کتاب التوحید)

عدل وانصاف

انسانیت کا ایک نہایت اہم تقاضا یہ ہے کہ آدمی لوگوں سے معاملہ کرتے ہوئے عدل وانصاف سے کام لے۔ وہ کسی حال میں بھی ظلم اور بے انصافی کا طریقہ اختیار نہ کرے۔ چنانچہ اسلام میں شدت کے ساتھ عادلانہ رویہ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ بے شک اللہ حکم دیتا ہے عدل کا اور احسان کا (النحل ۹۰) دوسری جگہ فرمایا کہ کہو کہ میرے رب نے مجھے قسط کا حکم دیا ہے (الاعراف ۲۹) قسط اور عدل کی مادی علامت ترازو ہے۔ جس طرح ترازو کسی چیز کو ٹھیک ٹھیک باٹ کے مطابق تول دیتا ہے۔ اسی طرح آدمی کا قول وعمل بھی ہونا چاہیے۔ آدمی کو چاہیے کہ جب اس کے سامنے کوئی معاملہ پیش آئے تو وہ پوری طرح منصفانہ روش اختیار کرے۔ جب وہ بولے تو اس کا بول حقیقت کے ترازو میں تلا ہوا ہو۔

قرآن میں بار بار حکم دیا گیا ہے کہ اجتماعی معاملات کو ہمیشہ عدل وانصاف کے مطابق طے کرو۔ مثلاً فرمایا کہ جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو (النساء ۵۸) اسی طرح فرمایا کہ معاملات میں جب بولو تو انصاف کی بات بولو (الانعام ۱۵۳) اسی طرح فرمایا کہ نزاعی معاملات پیش آئیں تو فریقین کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کراؤ اور ان کے ساتھ ہمیشہ انصاف کرو (الحجرات ۹)

یہ ایک عمومی حکم ہے۔ خاندان اور سماج میں ہمیشہ اختلافات پیش آتے ہیں۔ ایسے مواقع پر تمام متعلقین کا فرض ہے کہ وہ معاملہ کو انصاف کے مطابق طے کریں۔ کسی فریق کی طرف جھکے بغیر امر واقعہ کے مطابق معاملہ کا فیصلہ کرائیں۔

پھر فرمایا کہ اے ایمان والو، تم اللہ کے لیے قائم رہنے والے اور انصاف کے ساتھ گواہی دینے والے بنو۔ اور کسی گروہ کی دشمنی تم کو اس پر نہ ابھارے کہ تم انصاف نہ کرو، تم بہر حال انصاف کرو، یہی روش تقوی سے زیادہ قریب ہے (المائدہ ۸) اس سے معلوم ہوا کہ عدل وانصاف کی اہمیت اتنی زیادہ کہ زیر معاملہ آدمی دشمن ہو تب بھی انصاف کو نہ چھوڑا جائے، تب بھی وہی بات کہی جائے جو عدل وانصاف کے مطابق ہو۔ زمین وآسمان کا نظام سراپا عدل پر قائم ہے۔ یہاں انسان کے لیے بھی وہی روش درست ہے جو عدل وانصاف پر مبنی ہو۔ غیر عادلانہ روش کے لیے اس دنیا میں کوئی جگہ نہیں۔

قصد واعتدال

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : ما احسن القصد فی الغنی ما احسن القصد فی الفقر ما احسن القصد فی العبادۃ (کیا ہی اچھی ہے میانہ روی دولت مندی میں، کیا ہی اچھی ہے میانہ روی مفلسی میں، کیا ہی اچھی ہے میانہ روی عبادت میں) ایک اور روایت کے مطابق آپ نے فرمایا : القصدَ القصدَ تبلغوا (میانہ روی، میانہ روی، تم منزل پر پہنچ جاؤ گے)

قرآن میں ہے سفراً قاصداً (التوبہ ۴۲) یعنی بے مشقت سفر۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں ایک صحابی کہتے ہیں : کانت صلاتہ قصداً وخطبتہ قصداً (آپ کی نماز معتدل ہوتی تھی اور آپ کا خطبہ بھی معتدل ہوتا تھا) لسان العرب میں قصد کی تشریح کرتے ہوئے بتایا ہے کہ وہ درمیانی عمل جس میں نہ افراط ہو اور نہ تفریط (لسان العرب ۳/۳۵۴)

مومن کا طریقہ قصد کا طریقہ ہے، انفرادی معاملات میں بھی اور اجتماعی معاملات میں بھی۔ وہ ہمیشہ معتدل انداز اختیار کرتا ہے، خواہ وہ ایک طرح کی صورت حال میں ہو یا دوسری طرح کی صورت حال میں۔

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ اس لیے یہاں کسی فرد یا قوم کی حالت کبھی یکساں نہیں رہ سکتی۔ یہاں انسان کے لیے کبھی اچھے حالات ہوتے ہیں اور کبھی برے حالات۔ اس کو کبھی پُرسکون ماحول میں رہنا ہوتا ہے اور کبھی اشتعال انگیز ماحول میں۔ وہ لوگوں کے درمیان کبھی طاقتور ہوتا ہے اور کبھی کمزور۔ اس کی زندگی کبھی اپنوں کے درمیان گزرتی ہے اور کبھی غیروں کے درمیان۔ اس کو کبھی دوستوں کے ساتھ سابقہ پیش آتا ہے اور کبھی دشمنوں کے ساتھ۔

مگر ایمان اس کو ایک تھما ہوا انسان بنا دیتا ہے۔ وہ ہر حال میں اعتدال پر قائم رہتا ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے آپ کو اللہ کی رسّی میں باندھے رہتا ہے۔ اہل ایمان اہل اعتدال ہوتے ہیں۔ حالات کا اتار چڑھاؤ ان کے سکون کو برہم نہیں کرتا۔ ان کے خود اپنے مقرر اصول ان کی زندگی کا رخ متعین کرتے ہیں نہ کہ بیرونی اشخاص کے چھیڑے ہوئے مسائل۔

نفع بخشی

قرآن (الرعد ۱۷) میں بتایا گیا ہے کہ اس دنیا کو اس کے بنانے والے نے اس طرح بنایا ہے کہ یہاں جماؤ اور ٹھہراؤ صرف اس کو ملتا ہے جو نفع بخشی کا ثبوت دے (واما ماینفع الناس فیمکث فی الارض)

اس دنیا کی ہر چیز اسی اصول پر بنائی گئی ہے۔ اس دنیا میں کوئی چیز صرف اس وقت تک قائم رہتی ہے جب تک وہ دوسروں کے لیے نفع بخش بنی ہوئی ہو۔ جب کوئی چیز اپنی نفع بخشی کھو دے تو اس کے بعد وہ زندگی کا حق بھی کھو دیتی ہے۔ اس کے بعد فطرت کا نظام اس کو غیر مطلوب قرار دے کر اسے باہر پھینک دیتا ہے۔

اسی نظام فطرت کو خدا نے انسان کے لیے بھی پسند کیا ہے (آل عمران ۸۳) خدا کا مطلوب انسان وہ ہے جو اس دنیا میں ایک نفع بخش وجود بن کر رہے۔ جو حقیقی معنوں میں دینے والا بن جائے۔ جس سے دوسروں کو وہ چیز مل رہی ہو جو انھیں اپنی زندگی اور بقا کے لیے درکار ہے۔ ایسا ہی انسان یہ حق رکھتا ہے کہ اس کو انسان کہا جائے۔ ایسا ہی انسان اس کا مستحق ہے کہ اس کے لیے خدا کی اس دنیا میں کامیابی اور ترقی کا فیصلہ کیا جائے۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے جو شخص اپنے بھائی کو فائدہ پہنچا سکے تو وہ ضرور اس کو فائدہ پہنچائے (مَن استطاع منکم ان ینفع اخاہ فلیفعل) صحیح مسلم بشرح النووی، الجزء الرابع عشر، صفحہ ۱۸۶

نفع بخش بننے کے لیے اس کی ضرورت نہیں کہ آدمی بہت زیادہ اسباب و وسائل کا مالک ہو۔ ہر آدمی اپنے امکان کے دائرہ میں دوسرے کے لیے نفع بخش بن سکتا ہے۔ مثلاً کسی کے حق میں خیر خواہی کا ایک کلمہ بھی اس کو نفع پہنچانا ہے۔ اسی طرح کسی کو ایک اچھا مشورہ دینا، کسی کا بوجھ اٹھا دینا، کسی کے کام میں اپنی مدد شامل کر دینا، کسی بھٹکے ہوئے کو راستہ دکھا دینا، بقدر وسعت کسی کی مالی مدد کرنا، راستہ کی رکاوٹوں کو دور کرنا، وغیرہ سب نفع بخشی میں شامل ہیں۔ حتی کہ اگر کوئی شخص کسی بھی قسم کی مدد پہنچانے کی پوزیشن میں نہ ہو تو وہ اپنے بھائی کے حق میں نیک دعا کرے۔ یہ بھی اس کی طرف سے نفع پہنچانے کا ایک کام ہوگا۔

پڑوسی کے ساتھ

قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ تم لوگ اچھا سلوک کرو رشتہ دار پڑوسی کے ساتھ، اجنبی پڑوسی کے ساتھ اور پاس بیٹھنے والے کے ساتھ اور مسافر کے ساتھ (النساء ۳۶) پڑوسی کے حقوق کا حکم اس تفصیل کے ساتھ دینے کا مطلب یہ ہے کہ ہر قسم کے پڑوسی کے ساتھ اچھا سلوک کرنا واجب ہے، خواہ وہ قریب کا پڑوسی ہو یا دور کا پڑوسی۔ خواہ وہ وقتی پڑوسی ہو یا مستقل پڑوسی، خواہ وہ گھر کا پڑوسی ہو یا ایسا پڑوسی ہو جو تعلیم یا کاروبار یا سفر کے دوران آدمی کے ساتھ ہو جائے۔ جب بھی اور جہاں بھی ایک آدمی دوسرے آدمی کے ربط میں آئے تو لازم ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کے انسانی حقوق کا لحاظ کرے، ایک شخص دوسرے شخص کو کسی بھی اعتبار سے شکایت کا موقع نہ دے۔ ایک مسلمان کو فرد کے اعتبار سے بھی اچھا پڑوسی بننا ہے، اور وسیع تر سطح پر قومی اعتبار سے بھی اسے اچھا پڑوسی ہونے کا ثبوت دینا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، کوئی بندہ مومن نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ وہ اپنے پڑوسی کے لیے، یا یہ فرمایا کہ اپنے بھائی کے لیے، وہی پسند کرے جو وہ خود اپنے لیے پسند کرتا ہے (والذی نفسی بیدہ لا یؤمن عبد حتی یحبَّ لجارہ أو قال لأخیہ ما یحبُّ لنفسہ) ایک اور روایت کے مطابق، آپ نے فرمایا کہ وہ شخص جنت میں نہیں جائے گا جس کے شر سے اس کا پڑوسی امن میں نہ ہو (لا یدخلُ الجنۃ من لا یأمَنُ جارُہ بوائقَہ) صحیح مسلم بشرح النووی ۲/۱۷

ایک حدیث میں ہے کہ: خیر الاصحاب عند اللہ خیرھم لصاحبہ وخیر الجیران عند اللہ خیرھم لجارہ۔ یعنی اللہ کے نزدیک سب سے اچھا ساتھی وہ ہے جو اپنے ساتھی کے لیے اچھا ہو اور اللہ کے نزدیک سب سے اچھا پڑوسی وہ ہے جو اپنے پڑوسی کے لیے اچھا ہو (الترمذی) آپ نے فرمایا: من کان یؤمن باللہ فلا یؤذِ جارَہ (جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے پڑوسی کو نہ ستائے (البخاری) اسی طرح آپ نے فرمایا: من کان یؤمن باللہ فلیکرم جارہ (جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے پڑوسی کی عزت کرے (البخاری)

سچائی

قرآن (الاحزاب) میں اہل ایمان کو سچ بولنے والے مرد اور سچ بولنے والی عورتیں (والصادقین والصادقات) کہا گیا ہے۔ یہ کسی مرد یا کسی عورت کی نہایت اعلیٰ انسانی صفت ہے کہ جب وہ بولے تو ہمیشہ سچ بولے۔ وہ اپنی زبان سے کبھی سچ کے خلاف کوئی بات نہ نکالے۔ یہی راستبازانہ کردار کسی انسان کے شایان شان ہے۔

اس سلسلہ میں بہت سی حدیثیں آئی ہیں جو سچ کی اہمیت کو بتاتی ہیں۔ مثلاً ایک روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: علیکم بالصدق فان الصدق یھدی الی البر، وایاکم والکذب فان الکذب یھدی الی الفجور (صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والآداب) یعنی تم ہمیشہ سچ بولو، کیوں کہ سچ بولنا آدمی کو نیکی کی طرف لے جاتا ہے۔ اور تم جھوٹ بولنے والے سے بچو، کیونکہ جھوٹ بولنا آدمی کو برائی کی طرف لے جاتا ہے۔

اس حدیث میں سچ بولنے کا حکم بھی دیا گیا ہے اور اسی کے ساتھ اس کی حکمت بھی بتا دی گئی ہے۔ جب آدمی سچ بولنے کا اہتمام کرتا ہے تو اس کے اندر سچائی والی شخصیت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے مزاج اور اس کی سوچ پر سچائی کا رنگ غالب آجاتا ہے۔ اس کے اندر ایک ایسی روح پرورش پاتی ہے جو نفسیاتی پیچیدگی کی خرابیوں سے پاک ہو۔ اس طرح سچ بولنے کی صفت اس کو ہر اعتبار سے ایک سچا انسان بنا دیتی ہے۔

اس کے برعکس جس آدمی کا حال یہ ہو کہ وہ بولے تو جھوٹ بولے، اس کی اندرونی شخصیت گندی ہوتی رہتی ہے۔ اس کے اندر پاک صاف روح کی پرورش نہیں ہوتی۔ وہ برائیوں میں لت پت ہوتا چلا جاتا ہے۔

اسی لیے حدیث میں آیا ہے کہ: احب الحدیث الیّ اصدقہ (صحیح البخاری) یعنی سب سے زیادہ اچھی بات میرے نزدیک وہ ہے جو سچی بات ہو۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: التاجر الصدوق الامین مع النبیین (الترمذی، کتاب البیوع) یعنی سچا اور امانت دار تاجر قیامت کے دن نبیوں کے ساتھ ہوگا۔

حق رسانی

ہجرت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمانؓ اور حضرت ابو الدرداءؓ کے درمیان مواخاۃ قائم فرمائی تھی۔ حضرت سلمان اور حضرت ابوالدرداء کا جب ساتھ ہوا تو حضرت سلمان نے دیکھا کہ ابو الدرداء دن کو روزہ رکھتے ہیں اور رات کو کثرت سے نمازیں پڑھتے ہیں۔ دوسری انسانی ذمہ داریوں کی ادائگی کے لیے ان کے پاس زیادہ وقت باقی نہیں رہتا۔

حضرت سلمان نے حضرت ابوالدرداء کو اس سے منع کیا۔ انھوں نے کہا کہ خدا کے حقوق کے ساتھ انسانوں کے حقوق بھی تمہارے اوپر ہیں۔ تم کو چاہیے کہ تم ہر حق دار کا حق ادا کرو (فَاَعطِ کلَّ ذِی حقٍّ حقَّہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کا علم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ سلمان نے ٹھیک کہا (صدقَ سلمان) دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ سلمان فقیہہ ہیں۔ سلمان کو علم میں حصہ ملا ہے (فتح الباری بشرح صحیح البخاری ۴/۲۴۹ - ۲۴۷)

حق داروں کو ان کا حق پہنچانے کا یہ معاملہ اسلام میں اتنا سنگین ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ اگر تم نے دنیا میں حق دار کو اس کا حق نہ دیا تو قیامت کے دن تمہیں ان کا حق ادا کرنا ہوگا۔ لَتُؤَدُّنَّ الحقوق الی اھلھا یوم القیامۃ (صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ) یعنی موجودہ امتحان کی دنیا میں جو آدمی حقوق کی ادائگی میں ناکام رہے گا وہ آنے والے فیصلہ کے دن شدید تر انداز میں اس کا بھگتان ادا کرنے پر مجبور ہوگا۔

حقوق کی ادائگی کا یہ معاملہ کسی ایک چیز سے متعلق نہیں ہے بلکہ تمام چیزوں سے متعلق ہے۔ مثلاً گھر کا حق یہ ہے کہ آپ اپنے بیوی بچوں کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کو پورا کریں۔ پڑوسی کا حق یہ ہے کہ آپ ان کے لیے کسی قسم کا کوئی مسئلہ نہ پیدا کریں۔ راستہ کا حق یہ ہے کہ آپ کوئی ایسا فعل نہ کریں جس سے دوسرے راستہ چلنے والوں کو تکلیف پہنچے۔ سماج کا حق یہ ہے کہ آپ تمام لوگوں کے ساتھ خیر خواہی کا معاملہ کریں۔ قوم کا حق یہ ہے کہ آپ اس کی صلاح وفلاح کو اپنی ذمہ داری سمجھیں اور کبھی اس سے غافل نہ ہوں۔

حقوق کی ادائگی ایک مکمل نظریہ ہے اور اس کا تعلق زندگی کے تمام معاملات سے ہے۔

غصہ نہیں

قرآن میں مومن کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ جب ان کو غصہ آتا ہے تو وہ معاف کر دیتے ہیں (واذا ما غضبوا هم يغفرون) الشوریٰ ۳۷

اس کا مطلب یہ ہے کہ مومن کو جب دوسرے شخص سے ایسا سلوک ملتا ہے جو اسے غصہ دلا دے تو وہ غصہ کا جواب غصہ سے نہیں دیتا۔ بلکہ وہ غصہ کا جواب معافی سے دیتا ہے۔ وہ ردعمل کے بجائے درگزر کا طریقہ اختیار کر کے پہلے ہی مرحلہ میں اس کو ختم کر دیتا ہے۔ وہ فریق ثانی سے الجھنے کے بجائے خود اپنی ذات میں مشغول ہو جاتا ہے۔

ایک شخص پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اس نے کہا کہ اے خدا کے رسولؐ، مجھے کوئی ایسی بات بتائیے جس کو بس اپنی زندگی بنا لوں۔ اور وہ بات مختصر ہو تا کہ میں اسے بھول نہ جاؤں۔ آپؐ نے جواب دیا: لا تغضب۔ یعنی غصہ نہ کر (مؤطأ الامام مالک، صفحہ ۶۵۲)

غصہ کبھی خلا میں نہیں آتا۔ غصہ ہمیشہ اس وقت آتا ہے جب کہ کوئی شخص آپ سے غصہ دلانے والی بات کرے۔ جب کوئی شخص آپ کے ساتھ برا سلوک کرے۔ جب کسی سے آپ کو ایسی تکلیف پہنچے جو آپ کی انا کو بھڑکانے والی ہو۔ غصہ ایک جوابی عمل ہے۔ وہ ہمیشہ اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب کسی سے آپ کو کوئی ناپسندیدہ تجربہ پیش آیا ہو۔

ایسے موقع پر ایک طریقہ ردعمل کا ہوتا ہے، یعنی جو کچھ دوسرے شخص نے کیا ہے وہی خود بھی کرنا۔ مگر یہ اسلام کی تعلیم نہیں۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ دوسرا شخص آپ کو غصہ دلائے تب بھی آپ غصہ نہ ہوں۔ دوسرا شخص اشتعال انگیزی کرے تب بھی آپ اپنے کو مشتعل ہونے سے بچا لیں۔

مومن کو یقین ہوتا ہے کہ لوگوں کی تکلیفوں پر اگر وہ صبر کر لے تو خدا کے یہاں اس کو زیادہ بہتر اجر ملے گا۔ یہ غصہ، اس کے سینہ میں ایک ایسا اتھاہ سکون پیدا کر دیتا ہے جو کسی بھی مخالفانہ بات سے برہم نہ ہو۔ وہ عین اپنے ایمانی مزاج کے تحت غصہ کو معافی میں بدل دیتا ہے۔ وہ اشتعال انگیزی کو اعراض کے خانہ میں ڈال دیتا ہے۔ وہ انا کو بھڑکانے والی بات سے برعکس طور پر تواضع اور انسانیت کی غذا لے لیتا ہے۔

امانت اور عہد

قرآن میں اہل حق کی ایک پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ وہ اپنی امانتوں کا اور اپنے عہد کا پورا خیال کرنے والے ہوتے ہیں (والذین هم لاماناتهم وعهدهم راعون) مولانا شبیر احمد عثمانی نے اس کی مختصر اور جامع تفسیر ان الفاظ میں کی ہے: یعنی وہ امانت اور قول و قرار کی حفاظت کرتے ہیں، خیانت اور بدعہدی نہیں کرتے، نہ اللہ کے معاملہ میں اور نہ بندوں کے معاملہ میں (صفحہ ۳۴۴)

ہر انسان کے پاس جو کچھ ہے وہ سب کا سب امانت ہے، وہ یا تو خدا کی دی ہوئی امانت ہے یا بندوں کی دی ہوئی امانت۔ اسی طرح ہر انسان عہد اور قرار میں بندھا ہوا ہے۔ کچھ عہد ایسے ہیں جو اس نے لفظی صورت میں کر رکھے ہیں، اور کچھ عہد ایسے ہیں جو الفاظ بولے بغیر اپنے آپ اس کے اوپر قائم ہوتے ہیں۔ ان تمام قسم کی امانتوں اور ان تمام قسم کے عہدوں کو اسے پورا کرنا ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو وہ انسانیت کے معیار پر پورا نہیں اترتا۔ وہ اللہ کے نزدیک اپنے آپ کو مجرم ثابت کر رہا ہے۔

آدمی کا جسم اور اس کا قلب و دماغ خدا کی امانت ہے۔ اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے اس پورے وجود کو صرف اسی حد کے اندر استعمال کرے جو خدا نے اس کے لیے مقرر کر دی ہے۔ اس کا ہاتھ اور پاؤں انصاف کے لیے اٹھے مگر وہ ظلم کے لیے نہ اٹھے۔ اس کا ذہن خیر خواہی کی بات سوچے مگر وہ بدخواہی کی بات کبھی نہ سوچے۔ اسی طرح انسانوں کی جو امانتیں اس کے پاس ہیں، خواہ وہ لکھی ہوئی ہوں یا بغیر لکھی ہوئی، وہ ان کو پوری طرح امانت داروں کو ادا کرے۔ وہ دوسرے کی چیز کو کبھی اپنی چیز نہ سمجھے۔

اسی طرح ہر آدمی ایک طرف خدا اور دوسری طرف بندوں کے عہد میں بندھا ہوا ہے۔ قرآن کے مطابق، ایک خدا کا فطری عہد ہے جس میں ہر ایک انسان پوری طرح شامل ہے۔ دوسرا ایمانی عہد ہے، اس میں وہ لوگ شامل ہیں جو خدا پر باقاعدہ ایمان لائیں۔ اور شعوری طور پر خدا کے عہد میں بندھ جائیں۔ اس کے بعد بندوں کے عہد کا معاملہ ہے۔ کچھ الفاظ میں لکھے ہوئے عہد ہیں، اور کچھ وہ ہیں جو کسی خاندان یا سماج یا ریاست کا فرد ہونے کی حیثیت سے آدمی کے اوپر اپنے آپ قائم ہوتے ہیں۔ ان تمام عہدوں اور ذمہ داریوں کو پورا کرنا آدمی کا فطری فرض بھی ہے اور شرعی فرض بھی۔

پاکی اور صفائی

پاک اور صاف ستھرا رہنے کو اسلام میں بہت پسند کیا گیا ہے۔ قرآن میں ہے کہ : ان اللہ یحب التوابین و یحب المتطہرین (اللہ محبوب رکھتا ہے توبہ کرنے والوں کو اور اللہ محبوب رکھتا ہے پاک رہنے والوں کو) البقرہ ۲۲۲

آدمی جب غلطی کرنے کے بعد شرمندہ ہوتا ہے اور دوبارہ سچائی کی طرف پلٹ آتا ہے تو اس عمل کو توبہ کہا جاتا ہے۔ توبہ کا یہ عمل آدمی کے اندرون کو پاک کر دیتا ہے۔ اسی طرح پانی باہر کی گندگی کو پاک کرنے کا ذریعہ ہے۔ توبہ کے ذریعہ آدمی اپنی روح کو پاک کرتا ہے اور پانی کے ذریعہ اپنے جسم کو۔ اور دونوں ہی چیزوں کی اسلام میں بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔

حدیث میں ہے کہ الطہور نصف الایمان (صحیح مسلم، کتاب الطہارۃ) یعنی پاکیزگی آدھا ایمان ہے۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ : ان اللہ نظیف یحب النظافۃ (الترمذی، کتاب الادب) یعنی اللہ نظیف ہے اور نظافت کو پسند کرتا ہے۔ ابن ماجہ، کتاب الطہارۃ میں ایک مستقل باب ہے جس کا عنوان ہے : باب ثواب الطہور (پاکی کے ثواب کا باب)

انسان ایک ایسی مخلوق ہے جس کو خصوصی طور پر حساسیت کی صفت عطا ہوئی ہے۔ اس لیے فطری طور پر انسان صفائی ستھرائی کو پسند کرتا ہے۔ اسلام چوں کہ دین فطرت ہے، اس لیے اس میں اس بات کی بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے کہ انسان ہمیشہ صاف ستھرا رہے۔ اس کا جسم، اس کا لباس، اس کا گھر، اس کی ہر چیز میں ستھراپن دکھائی دے۔

صفائی ستھرائی کی اسی اہمیت کی بنا پر اصحاب رسولؐ میں روزانہ غسل کا عام رواج تھا۔ موطا امام مالک (کتاب الطہارۃ) میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے صاحبزادہ کی روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میرے باپ (عبداللہ بن عمر) ہر وضو سے پہلے غسل کرتے تھے۔ اس طرح وہ روزانہ پانچ بار نہاتے تھے۔ خلیفہ سوم حضرت عثمان بن عفانؓ کے بارہ میں روایت ہے کہ وہ ہر دن ایک بار نہاتے تھے (کان عثمان یغتسل کل یوم مرۃ) مسند احمد

جسم اور روح کی صفائی اسلام کے تقاضوں میں سے ایک لازمی تقاضا ہے۔

حق کی ادائگی

البخاری میں روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تین شخص کے خلاف قیامت میں مدعی بنوں گا۔ ان میں سے ایک وہ شخص ہے جس نے ایک آدمی کو اپنے یہاں مزدور رکھا اور اس سے پورا کام لیا مگر اس نے اس کی مزدوری نہیں دی (رجلٌ استأجر اجیراً فاستوفیٰ منہ ولم یُعطہ اَجرَہ (مشکاۃ المصابیح ۲/۸۹۹)

ابن ماجہ نے حضرت عبد اللہ بن عمر رضؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اعطوُا الاجیرَ اجرَہ قبل ان یجفّ عرقُہ (مزدور کو اس کی مزدوری دو، اس سے پہلے کہ اس کا پسینہ خشک ہو) مشکاۃ المصابیح ۲/۹۰۰

موجودہ دنیا میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی دوسرے آدمی سے کام لیتا ہے۔ ایسے ہر معاملہ میں اسلام کا حکم یہ ہے کہ پوری اجرت دو، اور کام ختم ہونے کے بعد فوراً اسے ادا کرو۔ کام کروانے کے بعد مزدور سے یہ کہنا کہ اگلے دن آکر اجرت لے لینا، انتہائی غیر انسانی فعل ہے۔ اور ایسے پست فعل سے اسلام میں نہایت شدت کے ساتھ منع کیا گیا ہے۔

کام کروانے والے کی ضرورت اگر یہ ہے کہ اس کا کام ہو جائے تو کام کرنے والے کی ضرورت یہ ہے کہ اس کی محنت کا معاوضہ اسے بر وقت مل جائے۔ یہ ایک دوطرفہ تقاضا ہے۔ اور کام کرنے والے نے جب کام انجام دے دیا تو اب دوسرے شخص پر لازم ہو گیا کہ وہ اس کا مقرر معاوضہ ادا کرنے میں کسی قسم کی کوئی قابل شکایت بات نہ کرے۔

جہاں طے شدہ مزدوری کا معاملہ نہ ہو وہاں بھی اسلام کا تقاضا ہے کہ کسی نہ کسی صورت میں اس کا بدلہ پورا کیا جائے۔ اگر مادی بدلہ کا موقع نہ ہو تو اس کا شکریہ ادا کیا جائے۔ کھلے دل سے اس کی کارگزاری کا اعتراف کیا جائے۔ اچھے الفاظ کے ساتھ لوگوں کے سامنے اس کا ذکر کیا جائے۔ اس کے حق میں اللہ تعالےٰ سے نیک دعا کی جائے۔

محنت کا فوراً معاوضہ ادا کرنے سے سماج میں باہمی اعتماد بڑھتا ہے، اور اگر اس کے برعکس عمل کیا جائے تو پورا سماج بے اعتمادی اور بدگمانی کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔

بے مسئلہ

مومن ایک بے مسئلہ انسان ہوتا ہے۔ وہ ہر حال میں اور ہر ماحول میں مسٹر نو پرابلم بن کر رہتا ہے۔ اس معاملہ میں اس کی حساسیت اتنی بڑھی ہوئی ہوتی ہے کہ وہ معمولی درجہ میں بھی کسی کے لیے مسئلہ پیدا کرنا پسند نہیں کرتا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کا یہ حال تھا کہ ایک شخص گھوڑے پر سوار ہوتا اور اس کا کوڑا زمین پر گر پڑتا تو وہ کسی کو اتنی زحمت دینا بھی پسند نہیں کرتا تھا کہ وہ اس سے کہے کہ میرا کوڑا اٹھا کر مجھے دے دو۔ بلکہ خود گھوڑے سے اتر کر اپنا کوڑا اٹھاتا تھا (ابو داؤد ۱۲۴/۲)

حدیث میں بتایا گیا ہے کہ سب سے اچھا مسلم وہ ہے جس کے شر سے لوگ مامون رہیں (و یؤمَن شرّہ) ایک اور روایت میں ہے کہ مومن وہ ہے جو اللہ سے ڈرے اور لوگوں کو اپنے شر سے محفوظ رکھے (یتقی اللہ و یدع الناس من شرہ) صحیح البخاری، کتاب الجہاد

البخاری (کتاب الادب) میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر مسلم پر صدقہ ہے۔ یعنی اس کو دینے والا بننا چاہیے۔ پوچھا گیا کہ اگر کسی کے پاس کچھ نہ ہو۔ آپ نے فرمایا کہ وہ محنت کرکے کمائے اور پھر اس میں سے دے۔ پوچھا گیا کہ اگر وہ اب بھی کر سکے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ زبان سے اچھا کلمہ کہے۔ پوچھا گیا کہ اگر وہ اب بھی کر سکے تو آپ نے فرمایا : فلیمسك عن الشر فانہ لہ صدقۃ۔ یعنی وہ اپنے شر کو دوسروں سے روکے۔ کیوں کہ یہ بھی ایک عطیہ ہے (فتح الباری ۴۶۲/۱۰)

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ کامل ایمان والا مومن وہ ہے جو مجاہد بنے اور اللہ کے راستہ میں اپنے جان و مال کو خرچ کرے۔ اور اس کے بعد وہ آدمی جو کسی گھاٹی میں اللہ کی عبادت کرے اور لوگ اس کے شر سے بچے ہوئے ہوں (قد کُفِیَ الناسُ شرَّہ) سنن ابی داؤد ۵/۳

حدیث کی کتابوں میں کثرت سے اس قسم کی تعلیمات آئی ہیں۔ ان کا خلاصہ یہ ہے کہ سماج میں رہنے والے ایک مسلمان کے لیے کردار کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ وہ دوسروں کو نفع پہنچائے۔ اس کے بعد اسلامی کردار کا کم سے کم معیار یہ ہے کہ وہ پوری طرح بے ضرر بنا ہوا ہو، وہ کسی کے لیے کسی بھی قسم کا کوئی چھوٹا یا بڑا مسئلہ پیدا نہ کرے۔

مثبت طریقہ

قرآن میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ بھلائی اور برائی دونوں یکساں نہیں ہو سکتے۔ اس لیے تم برائی کا بدلہ اچھائی کے ذریعہ دو (ولا تستوی الحسنة ولا السیئة ادفع بالتی ھی احسن) یہ بات قرآن میں مختلف الفاظ میں بار بار کہی گئی ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان کو ہمیشہ مثبت ردعمل کا ثبوت دینا چاہیے۔ انھیں ہر حال میں منفی ردعمل سے بچنا چاہیے۔ ان کا سلوک دوسروں کے ساتھ عام حالات میں بھی بہتر ہونا چاہیے۔ اور اگر کوئی شخص یا گروہ اپنی طرف سے برے سلوک کا مظاہرہ کرے تب بھی خدا پرستوں کے اوپر فرض ہے کہ وہ ردعمل کی نفسیات میں مبتلا نہ ہوں۔ اس وقت بھی وہ بااصول انسان کا ثبوت دیں۔ برائی کے جواب میں بھی وہ اپنے اچھے سلوک پر قائم رہیں۔

مذکورہ آیت کی تشریح میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں: اَمرالله المؤمنين بالصبر عند الغضب والحلم عند الجهل والعفو عند الاساءة (تفسیر ابن کثیر ۴/۱۰۱) یعنی اللہ نے اس آیت میں مسلمانوں کو یہ حکم دیا ہے کہ جب انھیں غصہ آجائے تو وہ صبر و برداشت سے کام لیں۔ ان کے ساتھ جب کوئی شخص جہالت کرے تو وہ بردباری کا طریقہ اختیار کریں۔ اور جب ان کے ساتھ کوئی شخص برا سلوک کرے تو وہ اسے معاف کر دیں۔

اس اسلامی سلوک کو ایک لفظ میں مثبت سلوک کہا جا سکتا ہے۔ یعنی جوابی معاملہ نہ کرتے ہوئے ہر ایک سے معتدل معاملہ کرنا۔ دوسروں کی روش خواہ کچھ بھی ہو، اپنے آپ کو ہمیشہ اعلیٰ انسانی سلوک پر قائم رکھنا۔

مومن وہ ہے جو برتر حقیقتوں میں جینے لگے۔ جس کے سوچنے کی سطح عام انسانوں سے اوپر اٹھ جائے۔ ایسے انسان کے اندر بے پناہ تحمل کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کو اندرونی طور پر اتنا سکون مل جاتا ہے جو باہر کے کسی بھی واقعہ سے نہیں ٹوٹتا۔ جہاں لوگ غصہ کرتے ہیں وہاں اسے لوگوں کے اوپر ترس آتا ہے، جہاں لوگ بھڑک جاتے ہیں وہاں وہ سمندر کی طرح پرسکون بنا رہتا ہے۔

قول سدید

قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو اور درست بات کہو۔ وہ تمہارے اعمال سدھارے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرے اس نے بڑی کامیابی حاصل کی (الاحزاب ۷۰ - ۷۱)

اس قرآنی آیت میں ہمیشہ قول سدید (درست بات) کا حکم ہے۔ قول سدید کا مطلب ہے ٹھیک بات کہنا، عین وہی بات کہنا جو صحیح ہو اور واقعہ کے مطابق ہو۔ اصل حقیقت سے کچھ بھی اِدھر یا اُدھر ہٹی ہوئی نہ ہو۔ جس طرح تیر ٹھیک نشانہ کی طرف رخ کر کے چلایا جاتا ہے، اسی طرح قول سدید ٹھیک حقیقت کو سامنے رکھ کر بولا جاتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کرتے ہوئے فرمایا: اللّٰھم اھدِ قلبی وسدِّدْ لسانی (ابو داؤد، الترمذی، احمد) اے اللہ، میرے دل کو ہدایت دے اور میری زبان کو قول سدید کی توفیق دے۔ اس دعا سے اندازہ ہوتا ہے کہ قول سدید کی اسلام میں کتنی زیادہ اہمیت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قول سدید کسی شخص کے مومن و مسلم ہونے کی پہچان ہے۔

انسانی کلام کی دو قسمیں ہیں۔ ایک غیر سدید کلام، دوسرا وہ جو پورے معنی میں سدید (درست) کلام ہو۔ سدید کلام وہ ہے جو عین مطابقِ حقیقت ہو۔ جو واقعات و حقائق پر مبنی ہو۔ جس کی پشت پر ٹھوس دلائل موجود ہوں۔ جس میں ساری رعایت زیر بحث معاملہ کی ہو، کسی بھی دوسری چیز کی رعایت اس میں شامل نہ ہو۔ جو تعصب سے پوری طرح پاک ہو۔

اس کے برعکس غیر سدید کلام وہ ہے جس میں حقیقت کی رعایت شامل نہ ہو۔ جس کی بنیاد ظن و گمان پر رکھی گئی ہو، جس کی حیثیت محض رائے زنی کی ہو نہ کہ حقیقتِ واقعہ کے اظہار کی۔ پہلے قسم کا کلام خدا کا پسندیدہ کلام ہے اور دوسرے قسم کا کلام خدا کا مبغوض کلام۔

انسان کی انسانیت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ جب بھی بولے قول سدید کی زبان میں بولے۔ قول سدید کسی انسان کی انسانیت کا ثبوت ہے۔ اور قول غیر سدید اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کو بولنے والا انسانیت سے خارج ہے، خواہ بظاہر وہ انسان کی صورت میں دکھائی دیتا ہو۔

تیسیر پسندی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی کا ایک واقعہ ہے۔ ایک دن آپ مدینہ کی مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے، کچھ اور صحابہ بھی وہاں موجود تھے۔ اسی دوران ایک اعرابی آیا۔ وہ مسجد کے اندر پیشاب کرنے لگا۔ لوگ اس کو مارنے کے لیے دوڑے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو منع کر دیا۔ آپ نے فرمایا کہ اس کو چھوڑ دو۔ پھر جب وہ پیشاب کر چکا تو آپ نے فرمایا کہ ایک ڈول پانی لاؤ اور وہاں پانی بہا کر اسے صاف کرو۔

آخر میں اس کی وجہ بتاتے ہوئے آپ نے فرمایا: فانما بُعثتم مُیسرین ولم تُبعثوا مُعسرین۔ یعنی تم آسانی پیدا کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو، تم مشکل پیدا کرنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے (فتح الباری بشرح صحیح البخاری ۱/ ۳۸۶)

اس سے اسلام کا ایک مستقل اصول معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اجتماعی زندگی میں جب کسی کی طرف سے کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش آئے تو اہل ایمان کی ساری توجہ پیدا شدہ مسئلہ کو حل کرنے پر لگنا چاہیے نہ کہ مسئلہ پیدا کرنے والے کو سزا دینے پر۔ ایسے موقع پر اہل ایمان کے اندر اصلاح کا جذبہ ابھرنا چاہیے نہ کہ انتقام لینے کا جذبہ۔ ایسی صورت حال میں وہ طریقہ اختیار کرنا چاہیے جو مسئلہ کو گھٹانے والا ہو نہ کہ مسئلہ کو اور زیادہ بڑھا دینے والا۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے کہیں آگ لگ جائے تو فطرت کا تقاضا ہے کہ اس کو فوراً بجھایا جائے نہ کہ اس کو اور زیادہ بھڑکانے کی کوشش کی جائے۔

ہر نزاعی معاملہ میں ایک تیسیر کی صورت ہوتی ہے اور دوسری تعسیر کی صورت۔ ایک صورت اختیار کرنے میں پیش آمدہ مسئلہ دبتا ہے۔ اور دوسری صورت اختیار کرنے میں پیش آمدہ مسئلہ اور زیادہ شدت کے ساتھ ابھر آتا ہے۔ پہلی صورت تیسیر کی ہے، اور دوسری صورت تعسیر کی۔ اسلام ہمیشہ تیسیر کی صورت کو پسند کرتا ہے۔ تعسیر کی صورت کسی بھی حال میں اسلام میں پسندیدہ نہیں۔

یہ اسلام کا ایک مستقل اصول ہے۔ اس کا تعلق ذاتی زندگی سے بھی ہے اور اجتماعی زندگی سے بھی۔ اس کو گھر کے اندر کے معاملات میں بھی اختیار کرنا ہے اور گھر کے باہر کے معاملات میں بھی۔ وہ ایک مکمل اصول ہے اور ایک مکمل نظام حیات۔

قابل پیشین گوئی کردار

سب سے بہتر انسان کون ہے۔ اسلام کے نزدیک سب سے بہتر انسان وہ ہے جو قابل پیشین گوئی کردار (predictable character) کا حامل ہو۔ جس کے متعلق پیشگی طور پر یہ یقین کیا جا سکے کہ جب بھی اس سے سابقہ پڑے گا اس سے اچھائی ہی کا تجربہ ہو گا، جب بھی اس سے کوئی معاملہ پیش آئے گا وہ دوسروں کے لیے ایک سچا انسان ثابت ہو گا۔

روایات میں آتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کی ایک مجلس کے پاس کھڑے ہوئے۔ آپ نے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ کیا میں تم کو تمہارے اچھے شخص اور تمہارے برے شخص کے بارہ میں نہ بتاؤں۔ یہ سن کر لوگ خاموش رہے۔ تب آپ نے تین بار اپنے اس سوال کو دہرایا۔ اس کے بعد ایک شخص نے کہا کہ کیوں نہیں، اے خدا کے رسولؐ، آپ ہم کو ہمارے اچھے شخص اور ہمارے برے شخص کے بارہ میں ضرور بتائیے۔ آپ نے فرمایا کہ تم میں اچھا شخص وہ ہے جس سے بھلائی کی امید کی جائے اور جس کے شر سے لوگ مطمئن ہوں (خیرکم مَن یُرجیٰ خیرُہ ویؤمَن شرُّہ)

الترمذی، کتاب الفتن

اس حدیث کے مطابق، بہترین انسان وہ ہے کہ جب کسی سے اس کا سابقہ پیش آئے تو اس سے دوسرے کو میٹھا بول ملے۔ وہ دوسرے کے لیے نفع بخش ثابت ہو۔ وہ دوسرے کو خوشی کا تحفہ دے سکے۔ اس سے دوسرے شخص کو ہمیشہ انصاف کا تجربہ ہو۔ وہ دوسرے کے حق میں ایک با اصول اور باکردار انسان ثابت ہو۔

اس کا یہ قابل پیشین گوئی کردار اس وقت بھی باقی رہے جب کہ دوسرے شخص کی طرف سے اس کو کوئی شکایت پہنچی ہو۔ جب کہ دوسرے شخص سے اس کو زیادتی کا کوئی تجربہ ہوا ہو۔ ایسے ناموافق حالات میں بھی اس کا حق پسندی کا مزاج باقی رہے۔ وہ اشتعال انگیزی کا جواب بھی صبر وسکون کے ساتھ دے۔ اس کے متعلق یہ امید کی جائے کہ دوسروں کی طرف سے برے سلوک کے باوجود وہ اپنے اصول کے مطابق ان کے ساتھ حسن سلوک کی روش پر قائم رہے گا۔ اس کا کردار ہمیشہ اعلیٰ انسانی امید پر پورا اترے گا۔

رحمت کلچر

اسلامی کلچر رحمت کلچر ہے۔ اسلام میں رحمت کا پہلو اتنا زیادہ نمایاں ہے کہ وہ ان لوگوں کی پوری زندگی پر چھاجاتا ہے جو اسلام کے اصولوں کو پوری طرح اختیار کرلیں۔

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ایک آدمی دوسرے آدمی سے ملے تو وہ کہے السلام علیکم ورحمۃ اللہ (تمہارے اوپر اللہ کی سلامتی ہو اور اللہ کی رحمت ہو) ایک شخص کو چھینک آئے تو وہ کہے: الحمدللہ۔ اور سننے والا کہے: یرحمک اللہ (اللہ تمہارے اوپر رحمت کرے) نماز کے لیے مسجد میں داخل ہو تو کہے: اللّٰھم افتح لی ابواب رحمتك (اے اللہ، مجھ پر رحمت کے دروازے کھول دے) اسی طرح نمازی لوگ جب نماز کو ختم کرتے ہیں تو وہ اپنے دائیں اور بائیں منہ پھیر کر کہتے ہیں: السلام علیکم ورحمۃ اللہ (تم لوگوں کے اوپر اللہ کی سلامتی اور اللہ کی رحمت ہو)

اس طرح ہر موقع پر اور ہر مرحلہ میں سلامتی اور رحمت کے کلمات لوگوں کے منہ سے نکلتے ہیں۔ رحمت کے انداز میں سوچنا اور رحمت کے انداز میں بولنا یہ اہل ایمان کی امتیازی صفت بن جاتی ہے۔ ان کی پوری زندگی رحمت والفت کے تقاضوں میں ڈھل جاتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کثرت سے ایسے کلمات منقول ہیں جن کا آغاز اس طرح کے الفاظ سے ہوتا ہے: رَحِمَ اللّٰہُ امرأً (الترمذی، کتاب الصلاۃ) رَحِمَ اللّٰہ رجلاً (البخاری، کتاب البیوع) رحمك اللّٰہ (الترمذی، کتاب التفسیر) رحِمَ اللّٰہ امرأۃ (النسائی، باب قیام اللیل) یرحم اللّٰہُ نساء المهاجرات (البخاری، کتاب التفسیر) یرحمُك اللّٰہ (البخاری، کتاب الانبیاء) وغیرہ۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام لوگوں کے اندر کس قسم کا مزاج بنانا چاہتا ہے۔ وہ دراصل رحمت ومحبت کا مزاج ہے۔ اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ ہر موقع پر ایک آدمی کے اندر دوسرے آدمی کے لیے رحمت کے جذبات ابھریں۔ ہر موقع پر ایک آدمی دوسرے آدمی کو رحمت والفت کا تحفہ پیش کرے۔ حتی کہ اظہار اختلاف کا موقع ہو تب بھی مومن کی زبان سے ایسے الفاظ نکلتے ہیں کہ: خدا تمہارے اوپر رحم کرے، تم نے ایسا کیوں کر کہا۔

خدا رحیم ہے، وہ چاہتا ہے کہ اس کے بندے بھی رحیم بن کر دنیا میں رہیں۔

خیر پسند

زید بن مُھَلہِل نجد میں بعثت نبوی سے پہلے پیدا ہوئے۔ وہ شاعر تھے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے شمشیر زنی اور گھوڑے کی سواری میں شہرت حاصل کی۔ چنانچہ وہ زید الخیل کہے جانے لگے۔ خیل عربی زبان میں گھوڑے نیز گھوڑے سوار کو کہتے ہیں۔

انھوں نے اسلام سے پہلے فارس (شہ سوار) اور شمشیر زنی کی تعریف پر ایک پرجوش نظم کہی تھی۔ اس میں وہ اپنے قبیلہ کے بارہ میں کہتے ہیں کہ میری قوم لوگوں کی سردار ہے۔ اور سردار ہی اس وقت قائد بنتا ہے جب کہ شعلہ بار ہتھیلیوں نے جنگ کی آگ کو بھڑکا دیا ہو :

وقومی رؤوسُ الناسِ والرأسُ قائدٌ　　إذا الحربُ شبَّتھا الأکفُّ المساعِرُ

زید الخیل ہجرت کے بعد مدینہ آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور اسلام قبول کرلیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زید الخیل کا نام پسند نہیں کیا۔ آپ نے ان کا نام بدل کر زید الخیر رکھ دیا۔ ۹ ھ میں مدینہ میں ان کا انتقال ہوا۔

اس واقعہ سے اسلام کا مزاج معلوم ہوتا ہے۔ اسلام کا مقصد آدمی کو "زید شہ سوار" بنانا نہیں ہے بلکہ اسلام کا مقصد یہ ہے کہ آدمی "زید صاحب خیر" بنے۔ قدیم عرب میں گھوڑا دوڑانا اور تلوار کا کمال دکھانا ہیروانہ کام سمجھا جاتا تھا۔ پیغمبر اسلام نے ان کے جذبات کو موڑا۔ اور ان کو یہ ذہن دیا کہ وہ خیر کے حامل بنیں، وہ خیر کے میدان میں بڑے بڑے کارنامے انجام دیں۔ وہ لوگوں کو موت کا تحفہ نہ دیں بلکہ وہ لوگوں کو زندگی کا تحفہ دینے کی کوشش کریں۔

آجکل کی زبان میں اگر کہا جائے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اسلام کا خاص مقصد تخلیقی (creative) انسان پیدا کرنا ہے۔ اللہ پر ایمان آدمی کے اندر تخلیقی اوصاف کو جگا دیتا ہے۔ وہ ہر اعتبار سے ایک نیا انسان بن جاتا ہے۔ اس کی سوچ عام سوچ سے اوپر اٹھ جاتی ہے۔ اس کا کردار دوسرے لوگوں کے کردار سے بلند ہو جاتا ہے۔ وہ زمین میں رہتے ہوئے ایک آسمانی انسان بن جاتا ہے۔

مومن کا کام زید الخیل بننا نہیں بلکہ زید الخیر بننا ہے۔ یہی مومنانہ شخصیت کا خلاصہ ہے۔

محنت کی کمائی

قرآن میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں سے فرمایا کہ تم لوگ پاک اور طیّب چیزوں سے کھاؤ (المومنون ۵۲) پاکیزہ روزی سے پاکیزہ روح پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے اسلام میں پاکیزہ روزی پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔

البخاری کی ایک روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ما اکلَ احدٌ طعاماً قطُّ خیراً مِن اَن یاکُلَ مِن عمل یدیہ (مشکاۃ المصابیح ۲/۸۴۲) یعنی کسی آدمی کی سب سے زیادہ بہتر روزی یہ ہے کہ وہ اپنے ہاتھ کی محنت کا کھانا کھائے۔

مسند احمد کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ سب سے زیادہ پاکیزہ کمائی کون سی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ جو آدمی نے اپنے ہاتھ سے محنت کر کے کمایا ہو (قیل یارسولَ اللّٰہ اَیّ الکسبِ اطیبُ۔ قال: عمل الرجلِ بیدِہ) مشکاۃ المصابیح ۲/۸۴۷

محنت کی کمائی ہی دراصل کمائی ہے۔ اس کے بغیر جو حاصل کیا جائے وہ لوٹ ہے۔ محنت کرنے والا اپنی محنت سے جو کچھ حاصل کرتا ہے وہ اس کا جائز حق ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ غلط تدبیروں سے جو کچھ حاصل کیا جائے وہ دراصل دوسروں کا حصہ تھا جس کو ایک شخص نے کسی حق کے بغیر ناجائز طور پر اپنے لیے حاصل کر لیا۔

مذکورہ حدیث میں "ہاتھ" کا لفظ علامتی طور پر آیا ہے۔ اس میں جسم اور دماغ دونوں قسم کی محنت شامل ہے۔ سماجی سرگرمیوں میں دونوں قسم کی محنت کی ضرورت ہوتی ہے، اور دونوں طرح کی محنت جائز محنت ہے۔ آدمی خواہ جسمانی محنت سے حاصل کرے یا دماغی محنت سے، دونوں ہی یکساں طور پر اس حدیث کا مصداق ہوں گے۔ البتہ اس کو واقعی محنت ہونا چاہیے۔

محنت کی کمائی سے فرد کے اندر پاکیزہ شخصیت بنتی ہے اور سماج کے اندر پاکیزہ ماحول۔ اس طرح محنت کی کمائی سے انفرادی زندگی اور اجتماعی زندگی دونوں ہی درست ہوتی چلی جاتی ہیں۔

جس سماج میں لوگ محنت کر کے کمائیں وہاں منصفانہ ماحول بنے گا۔ اور جہاں لوگ بلا محنت حاصل کرنا چاہیں وہاں مجرمانہ ماحول۔

مالی تعاون

زندگی کی دوڑ میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی آگے چلا جاتا ہے اور کوئی پیچھے رہ جاتا ہے۔ کسی کے پاس ضرورت سے زیادہ مال آجاتا ہے اور کسی کو ضرورت سے کم ملتا ہے۔ ایسے حالات میں اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے کا مالی تعاون کریں۔ انسانی تقاضے کے تحت لوگ ایک دوسرے کے کام آئیں۔

اس سلسلہ میں قرآن میں بہت سی آیتیں آئی ہیں۔ مثلاً فرمایا : لِيُنفِقْ ذُو سَعَةٍ مِّن سَعَتِهِ۔ یعنی وسعت والے کو چاہیے کہ وہ اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرے (الطلاق ۷) اسی طرح فرمایا : وفی اموالهم حق للسائل والمحروم (الذاریات ۱۹) یعنی محسن اور متقی وہ لوگ ہیں جن کے مالوں میں سائل اور محروم کا حصہ ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کا پسندیدہ انسان وہ ہے جس کو مالی فراخی ملے تو اپنے مال میں سے وہ دوسروں کے لیے خرچ کرے۔ اس کی کمائی میں صرف انھیں کا حصہ نہ ہو جو ضرورت کے تقاضے کے تحت سوال کرتے ہیں۔ بلکہ اپنے مال میں وہ ان کا حصہ بھی سمجھے جو کسی وجہ سے محروم ہو گئے ہیں۔ جو مانگتے نہیں ہیں یا مانگنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ وہ خود ایسے لوگوں کو جانے اور ان کے یہاں پہنچ کر ان کی مدد کرے۔

حدیث کی کتابوں میں کثرت سے ایسی روایتیں ہیں جن میں مال خرچ کرنے پر ابھارا گیا ہے۔ مثال کے طور پر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن چند لوگوں کے بارہ میں جنت کی خوش خبری دی ہے، ان میں سے ایک وہ انسان ہے جس کو اللہ نے مال دیا پھر اس نے اپنے مال کو دوسروں کی مدد میں خرچ کیا

(ورجلٌ اعطاه الله مالاً فهو ينفقه) مسند احمد

اپنی کمائی کو دوسروں کی ضرورت پر خرچ کرنا اعلیٰ ترین انسانی صفت ہے، اور اسلام میں آخری حد تک اس کی تاکید کی گئی ہے۔ جس آدمی کو بھی مال کا کوئی حصہ ملتا ہے وہ اس کے لیے خدا کا ایک عطیہ ہوتا ہے۔ خدا اگر ضروری اسباب مہیا نہ کرے تو کوئی بھی شخص مال کمانے پر قادر نہیں ہو سکتا۔ اس لیے جب بھی کسی کو مال ملے تو اس پر لازم ہو جاتا ہے کہ خدا کی شکر گزاری کے طور پر وہ اس کا ایک حصہ نکالے اور اس کو خدا کے بندوں پر خرچ کرے۔

انسانیت عامہ

اسلام کے مطابق، پوری انسانیت خدا کا ایک کنبہ ہے۔ بیہقی کی ایک روایت ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمام انسان خدا کی عیال کی مانند ہیں۔ اور اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ انسان وہ ہے جو اس خدائی عیال کے ساتھ بہترین سلوک کرے (الخلق عیال اللہ واحبُّ الناس عند اللہ احسنھم لعیالہ) اس بات کو مولانا الطاف حسین حالی نے ایک شعر میں اس طرح کہا ہے :

یہ پہلا سبق تھا کتابِ ہدیٰ کا — کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا

سنن النسائی میں زید بن ارقم سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کے آخری پہر میں اٹھتے تو تہجد کی نماز سے فارغ ہو کر ذکر اور دعا میں مشغول ہو جاتے۔ اس دوران آپ کی زبان سے یہ الفاظ نکلتے کہ اے اللہ، میں گواہی دیتا ہوں کہ سارے بندے آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ (اللّٰھم انی اَشھد اَن العباد کلھم اخوۃ)

تہجد کی نماز کا حکم مکہ میں اترا تھا۔ اس طرح آپ کا یہ معمول مکی دور ہی میں شروع ہو گیا تھا۔ حدیث کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تہجد کے بعد آپ مختلف دعائیں پڑھتے تھے۔ تاہم مذکورہ دعا جس میں اخوت انسانی کی شہادت دی گئی ہے، وہ خاص طور پر مکی دور سے تعلق رکھتی ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے، مکہ کے مشرکین اس زمانہ میں آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو سخت ایذائیں دے رہے تھے۔ اس کے باوجود رات کی تنہائیوں میں آپ ان کو برادرانہ احساسات کے ساتھ یاد فرماتے تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام جو معیاری انسان دیکھنا چاہتا ہے وہ انسان وہ ہے جس کا حال یہ ہو کہ لوگ اگر اس کے دشمن بن جائیں، حتیٰ کہ وہ اس کو مٹانے کے درپے ہو جائیں۔ تب بھی اس کے دل میں لوگوں کے لیے برادرانہ احساسات ہی امنڈ رہے ہوں۔ حتیٰ کہ وہ اپنی تنہائیوں میں خدا کو گواہ بنا کر اس کا اعلان کر رہا ہو۔

اسلام آدمی کے اندر شفقت کا جذبہ ابھارتا ہے۔ جو آدمی اسلام کو اختیار کرتا ہے وہ عین اسی کے ساتھ سارے انسانوں کے لیے شفیق اور مہربان بن جاتا ہے۔

عالمی اخوت

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ نے تمام انسانوں کو ایک ہی جوڑے سے پیدا کیا ہے۔ یہ دراصل ایک ہی ماں اور باپ کی نسل ہے جو سارے کرۂ ارض پر پھیلی ہوئی ہے (النساء ۱) اس سے معلوم ہوا کہ تمام انسان، ظاہری اختلافات کے باوجود، باعتبار پیدائش ایک ہیں۔ دوسرے لفظ میں یہ کہ سب کے سب آپس میں خونی بھائی (blood brothers) ہیں۔

یہ اخوت ایک عالمی اخوت ہے۔ چنانچہ قرآن میں ایک طرف کہا گیا ہے کہ: انما المومنون اخوۃ۔ یعنی اہل ایمان سب آپس میں بھائی بھائی ہیں (الحجرات ۱۰) دوسری طرف غیر مسلموں کو بھی مسلمانوں کا بھائی بتایا گیا ہے۔ اہل ایمان اگر دینی اعتبار سے ہمارے بھائی ہیں تو غیر مسلم حیاتیاتی اعتبار سے تمام مسلمانوں کے لیے بھائی اور بہن کی حیثیت رکھتے ہیں۔

چنانچہ قرآن میں جن پیغمبروں کا نام آیا ہے، ان کی گمراہ قوموں کا ذکر ان کے بھائی کی حیثیت سے کیا گیا ہے۔ مثلاً والیٰ ثمود اخاھم صالحا (الاعراف ۷۳) والیٰ مدین اخاھم شعیبا (الاعراف ۸۵) اذ قال لھم اخوھم نوح (الشعراء ۱۰۶) اذ قال اخوھم ھود (الشعراء ۱۲۴) اذ قال لھم اخوھم لوط (۱۶۱) وغیرہ۔ اس طرح کی آیات میں پیغمبروں کی مخاطب قوموں کو پیغمبروں کا بھائی بتایا گیا ہے۔

حدیث میں کثرت سے ایسی تعلیمات ہیں جن میں تلقین کی گئی ہے کہ تم لوگ ایک دوسرے کے ساتھ بھائی اور بہن جیسا سلوک کرو۔ یہ بات کہیں عام الفاظ میں ہے اور کہیں مومن اور مسلم کے الفاظ میں۔ تاہم اس کا خطاب عمومی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ عام انسانوں کے لیے اس کی حیثیت گویا نصیحت کی ہے اور اہل ایمان کے لیے اس کی حیثیت فریضہ اور حکم کی۔

اسلام کے مطابق، خدا کے تمام بندے آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ پوری انسانیت ایک وسیع تر خاندان کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایک گھر کے اندر دو بھائیوں میں جو برادرانہ تعلق ہوتا ہے، وہی برادرانہ تعلق وسیع تر دائرہ میں تمام انسانوں سے مطلوب ہے۔ حدیث میں اگر کہیں المسلم اخو المسلم کا لفظ ہے تو وہ بھی گروہی معنی میں نہیں ہے بلکہ اصولی معنی میں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سچے انسان ہمیشہ بھائی بھائی کی طرح رہتے ہیں۔

وسیع تر آدمیت

صحیح البخاری میں حدیث کے ایک مجموعہ کا باب یہ ہے : باب رحمۃ الناس والبھائم یعنی انسانوں اور حیوانات کے ساتھ رحمت کا باب۔ اس کی تشریح میں ابن حجر العسقلانی نے لکھا ہے : (ای صدور الرحمۃ من الشخص لغیرہ۔ یعنی کسی شخص کی طرف سے اس کے غیر کے لیے مہربانی کا عمل۔ اسلام آدمی کے اندر رحمت و شفقت کا جو جذبہ پیدا کرتا ہے وہ اتنا زیادہ آفاقی ہے کہ اس کا اثر حیوانات اور نباتات کی دنیا تک پہنچتا ہے۔ ایسا انسان ہر ایک کے لیے شفیق بن جاتا ہے، حتیٰ کہ جانوروں اور درختوں کے لیے بھی۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک شخص کسی راستہ پر چل رہا تھا۔ اس کو سخت پیاس لگی۔ پھر اس کو راستہ میں ایک کنواں نظر آیا۔ اس نے اس کنویں سے پانی حاصل کیا۔ جب وہ باہر آیا تو اس نے ایک کتے کو دیکھا جو ہانپ رہا تھا۔ پیاس سے اس کا برا حال تھا۔ آدمی نے اپنے دل میں کہا کہ اس کتے کا بھی پیاس سے وہی حال ہو رہا ہے جو میرا حال ہوا تھا۔ وہ دوبارہ کنویں کے پاس گیا اور اپنے جوتے میں پانی نکال کر کتے کو پلایا۔ پھر اس آدمی نے اللہ کا شکر ادا کیا تو اللہ نے اس کو بخش دیا۔ لوگوں نے پوچھا کہ اے خدا کے رسولؐ، کیا ہمارے لیے حیوانات میں بھی اجر ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہر نرم و نازک جگر میں تمہارے لیے اجر ہے (فتح الباری ۱۰/۵۲۴) اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر احساس والی مخلوق کے ساتھ تمہیں شفقت کا معاملہ کرنا ہے اور ہر ایسے معاملہ پر اللہ کی طرف سے تمہیں انعام دیا جائے گا۔

اسی طرح درخت کو اسلام میں اتنی زیادہ اہمیت دی گئی کہ قرآن میں فرمایا کہ خدا کو ماننے والا انسان ایسا ہی ہوتا ہے جیسے کہ ایک درخت۔ وہ درخت کی مانند نفع بخش بن کر دنیا میں زندگی گزارتا ہے (ابراہیم ۲۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی مسلم جب ایک پودا لگاتا ہے۔ پھر وہ بڑا ہوتا ہے اور کوئی انسان یا کوئی جانور اس کا پھل کھاتا ہے تو یہ پودا لگانے والے کے لیے ایک صدقہ ہوتا ہے (فتح الباری ۱۰/۵۲۴) خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے اسلامی فوج روانہ کرتے ہوئے حکم دیا کہ تم لوگ کوئی درخت نہ کاٹنا (لا تقطعوا شجرا) دوسرے لفظوں میں یہ کہ اسلام میں درخت کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ کوئی درخت دشمن کا درخت ہو تب بھی اس کو نہ کاٹا جائے۔

اسلام کی آدمیت وسیع تر آدمیت ہے نہ کہ محدود آدمیت۔

عمومی عزت

جابر بن عبد اللہؓ ایک صحابی ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ مدینہ کے راستہ میں ایک جنازہ گزرا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے اور ہم بھی آپ کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ پھر ہم نے کہا کہ اے خدا کے رسولؐ، یہ تو ایک یہودی کا جنازہ تھا۔ آپ نے فرمایا کہ جب تم جنازہ کو دیکھو تو کھڑے ہو جاؤ (اذا رأیتم الجنازۃَ فقوموا)

ایک اور روایت میں ہے کہ سَہل بن حُنَیف اور قَیس بن سَعد قادسیہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے سے ایک جنازہ گزرا۔ اس کو دیکھ کر دونوں کھڑے ہو گئے۔ ان سے کہا گیا کہ یہ تو ایک ذمی (غیر مسلم) کا جنازہ تھا۔ دونوں نے جواب دیا کہ مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سے ایک جنازہ گزرا تو آپ کھڑے ہو گئے۔ آپ سے کہا گیا کہ یہ تو ایک یہودی کا جنازہ تھا، آپ نے فرمایا کہ کیا وہ انسان نہ تھا (الیست نفسا) فتح الباری بشرح صحیح البخاری ۳/۲۱۴

اس سے اسلام کا ایک نہایت اہم اصول معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ انسان ہر حال میں قابل احترام ہے، حتیٰ کہ اگر وہ غیر مسلم ہو یا دشمن گروہ سے تعلق رکھتا ہو، تب بھی دوسرے پہلوؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کو بحیثیت انسان دیکھا جائے گا، اور انسان ہونے کے اعتبار سے ہر حال میں اس کو عزت اور احترام دیا جائے گا۔

انسان خدا کی ایک ممتاز مخلوق ہے۔ قرآن کے لفظوں میں اس کو احسنِ تقویم (بہترین ساخت) کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے۔ انسان اپنی بناوٹ کے اعتبار سے تخلیق کا شاہکار ہے۔ کوئی انسان، اپنا ہو یا غیر، ہر حال میں وہ خدا کی مخلوق ہے۔ ہر حال میں وہ خالق کے کمالات کا ایک نمونہ ہے۔ اس لئے اختلاف کے باوجود وہ قابل احترام ہے۔ اجنبیت کے باوجود اپنی انسانی حیثیت میں وہ اس قابل ہے کہ اس کو عزت دی جائے۔

مومن ہر چیز میں خدا کا جلوہ دیکھتا ہے۔ ہر مخلوق میں اس کو خالق کا کرشمہ نظر آتا ہے۔ مومن کی یہ نفسیات مجبور کرتی ہے کہ وہ ہر انسان کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے۔ ہر انسان کے لیے اس کے دل میں قدر دانی کا جذبہ موجود ہو۔

آفاقی انسان

قرآن ایک عالمی کتاب ہے۔ اس کی تمام تعلیمات آفاقیت پر مبنی ہیں، قرآن میں جس خدا کا تصور دیا گیا ہے وہ رب العالمین ہے (الفاتحہ ۱) قرآن کا پیغمبر نذیر للعالمین ہے (الفرقان ۱) قرآن کے ذریعہ جو دین بھیجا گیا ہے وہ ایک کائناتی دین ہے (آل عمران ۸۳)

قرآن کا پیغام پوری انسانیت کے لیے ہے نہ کہ کسی مخصوص گروہ کے لیے۔ قرآن عالمی قدروں کو زندہ کرنا چاہتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

قال: لن تؤمنوا حتی ترحموا۔ قالوا کلنا رحیم یارسول اللہ۔ قال انہ لیس برحمۃ احدکم صاحبہ ولکنہا رحمۃ الناس رحمۃ العامۃ (فتح الباری ۱۰/۴۵۳)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم ہرگز مومن نہیں ہو سکتے جب تک تم رحم نہ کرو۔ لوگوں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، ہم میں سے ہر شخص رحم کرنے والا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم اپنے ساتھی پر مہربانی کرو۔ بلکہ اس سے مراد تمام لوگوں اور تمام انسانوں کے ساتھ رحم کرنا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب ایک شخص خدائے رب العالمین پر ایمان لاتا ہے تو عین اس کا ایمان ہی اس کے اندر آفاقی ذہن پیدا کر دیتا ہے۔ وہ فطرت سے جڑ جاتا ہے جو عین اپنی نوعیت کے اعتبار سے کائناتی ہے۔ وہ دریافت کرتا ہے کہ وہ وسیع تر انسانی برادری کا ایک جزء ہے کیونکہ ساری انسانی برادری ایک ہی خدا کی مخلوق اور اس کی عیال ہے۔

یہ آفاقی ذہن اس کے اندر آفاقی محبت کی پرورش کرتا ہے۔ سارے انسان اس کو اپنے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ اس کے سینہ میں سارے انسانوں کی محبت کا چشمہ ابل پڑتا ہے۔ وہ سب کو اپنا سمجھنے لگتا ہے اور اپنے آپ کو سب کا۔

اسلام کی بنیاد پر بننے والے انسان کا مزاج اپنے آپ اس کو تمام انسانوں کا خیرخواہ بنا دیتا ہے۔ وہ تمام انسانوں سے محبت کرنے والا ہو جاتا ہے۔ تمام انسانوں کی خدمت کرنے کا جذبہ اس کے اندر امنڈ پڑتا ہے۔ وہ ہر اعتبار سے ایک آفاقی انسان بن جاتا ہے۔

احترام انسانیت

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان فرمایا کہ ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی اور ہم نے ان کو خشکی اور تری میں سوار کیا۔ اور ان کو پاکیزہ چیزوں کا رزق دیا اور ہم نے ان کو بہت سی مخلوقات پر فوقیت دی (الاسراء ۷۰) اس سے معلوم ہوا کہ انسان عین اپنی پیدائش کے اعتبار سے عزت و تکریم کا مستحق ہے۔ یہ تکریم ہر انسان کو فطری طور پر حاصل ہے، خواہ وہ ایک گروہ سے تعلق رکھتا ہو یا دوسرے گروہ سے۔

حدیث میں ہے کہ : لیس منا من لم یرحم صغیرنا و لم یوقر کبیرنا (الترمذی، کتاب البر) یعنی وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو ہمارے چھوٹے پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑے کی عزت نہ کرے۔ اسی طرح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اس کو چاہیے کہ وہ اپنے پڑوسی کی عزت کرے، جو شخص اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اس کو چاہیے کہ وہ اپنے مہمان کی عزت کرے (من کان یؤمن باللہ والیوم الآخر فلیکرم جارہ، من کان یؤمن باللہ والیوم الآخر فلیکرم ضیفہ)

قرآن و حدیث میں کثرت سے ایسے احکام ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ جو شخص خدا کے دین پر ایمان لائے اس پر لازم ہے کہ وہ خدا کے بندوں کا احترام کرے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی آدمی کی خدا پرستی کا اصل امتحان جہاں لیا جا رہا ہے وہ یہی لوگ ہیں۔ خدا سے تعلق کا اظہار اس دنیا میں دوسرے انسانوں سے تعلق کی شکل میں ہوتا ہے۔ خدا سے محبت کرنے والا، عین اپنے اندرونی جذبہ کے تحت خدا کے بندوں سے محبت کرنے لگتا ہے۔

انسان کا یا انسانیت کا احترام کرنا یہ اسلام کی ایک بنیادی تعلیم ہے۔ کوئی آدمی اپنے مذہب کا ہو یا دوسرے مذہب کا۔ اپنی قوم سے تعلق رکھتا ہو یا غیر قوم سے۔ اپنے ملک کا آدمی ہو یا کسی اور ملک کا باشندہ ہو، حتیٰ کہ وہ دوست فرقہ سے تعلق رکھتا ہو یا دشمن فرقہ سے، ہر حال میں وہ قابل احترام ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ اختلاف کے باوجود انسان کا احترام کیا جائے۔ اس کا رویہ اگر مخالفانہ ہو تب بھی اس کے رویہ کو نظر انداز کر کے اس کے ساتھ عزت کا سلوک جاری رکھا جائے۔ اسلام کی نظر میں ہر انسان انسان ہے، ہر انسان اس قابل ہے کہ اس کا احترام کیا جائے۔

سب پر سلامتی

اسلام میں زندگی کے جو آداب بتائے گیے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب دو آدمی آپس میں ملیں تو وہ ایک دوسرے کو سلام کریں۔ یعنی ایک شخص کہے کہ السلام علیکم (تمہارے اوپر سلامتی ہو) اس کے بعد دوسرا شخص جواب میں کہے : وعلیکم السلام (تمہارے اوپر بھی سلامتی ہو)

سلام کا یہ کلمہ ایک قسم کی دعا ہے۔ ایک مومن کے دل میں دوسرے مومن کے لیے خیر خواہی کا جذبہ ہوتا ہے۔ یہ جذبہ مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ ان میں سے ایک مذکورہ سلام کا طریقہ ہے۔ سلام کی بہترین تشریح وہ ہے جو ابن عُیینہ سے نقل کی گئی ہے۔ انھوں نے کہا : کیا تم جانتے ہو کہ سلام کیا ہے۔ سلام کرنے والا دوسرے شخص سے کہتا ہے کہ تم مجھ سے محفوظ ہو (ھل تدری ما السلام ، یقول انت آمن منّی)

سلام کی یہ تشریح بہت بامعنی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں ہر اعتبار سے تمہارا خیر خواہ ہوں۔ میری طرف سے تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔ میں تمہارے لیے کوئی مسئلہ پیدا کرنے والا نہیں۔ تم سے میری گفتگو ہو تو میں ہرگز ایسا نہیں کروں گا کہ میں تم سے بدکلامی کرنے لگوں۔ تمہارے ساتھ میرا کوئی لین دین ہو تو میں تمہارے ساتھ غصب اور خیانت کا معاملہ نہیں کروں گا۔ بلکہ تمہارا جو حق ہے، اس کو انصاف اور دیانت کے ساتھ پورا پورا ادا کردوں گا۔ تمہارے خلاف اگر مجھے کوئی شکایت ہو جائے تب بھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں عدل کے راستہ سے ہٹ جاؤں اور تمہارا دشمن بن کر تمہاری جڑ کاٹنے لگوں۔ تم سے اگر مجھے کوئی اختلاف ہو تو میں اس اختلاف کو جائز تنقید کے دائرہ میں رکھوں گا، میں اس کو عیب جوئی، الزام تراشی اور کردار کشی کی حد تک ہرگز نہیں لے جاؤں گا۔

السلام علیکم کوئی رسمی کلمہ نہیں، وہ بااصول زندگی گزارنے کا ایک عہد ہے۔ السلام علیکم کہنے والا گویا اس بات کا اعلان کر رہا ہوتا ہے کہ روزمرہ کی زندگی میں اس کا سلوک دوسروں کے ساتھ کیسا ہوگا۔ وہ سلامتی اور خیر خواہی کا ہوگا نہ کہ بے امنی اور بدخواہی کا۔

خدمت عام

قرآن میں اعلیٰ انسان کی جو صفات بتائی گئی ہیں، ان میں سے ایک صفت یہ ہے کہ وہ لوگ جن کے مالوں میں مقرر حصہ ہے، سوال کرنے والے کے لیے بھی اور محروم کے لیے بھی (والذین فی اموالھم حق معلوم۔ للسائل والمحروم) المعارج ۲۴-۲۵

یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ دوسروں کے کام آئے۔ وہ دوسروں کی خدمت کر سکے۔ اسلام آدمی کے اس جذبہ کو آخری حد تک جگا دیتا ہے۔ جو آدمی مومنانہ اور مسلمانہ جذبات میں جی رہا ہو، وہ سمجھنے لگتا ہے کہ میرا مال یا میری چیزیں صرف میری نہیں ہیں۔ اس میں دوسروں کا بھی حق ہے۔ وہ نہ صرف ان لوگوں کی مدد کرتا ہے جو اس سے سوال کریں۔ بلکہ وہ ان کا بھی مددگار بن جاتا ہے جو ضرورت مند ہیں، اگرچہ انھوں نے کسی وجہ سے سوال نہیں کیا۔

قرآن میں محروم کا جو لفظ آیا ہے، اس کی تشریح امام مالکؒ نے یہ کی ہے کہ اس سے مراد وہ ہے جو رزق سے محروم رہا (انہ الذی یحرم الرزق) تفسیر القرطبی ۱۷/۳۹

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے ایک جانور کو دیکھا جو بھوکا تھا اور بظاہر اس کے کھانے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ انھوں نے کہا کہ یہ بھی انھیں میں سے ہے جس کو قرآن میں محروم کہا گیا ہے۔ (القرطبی ۱۷/۳۹) مفسر الرازی نے مزید توسیع دی ہے اور لکھا ہے کہ اس میں درخت بھی شامل ہیں۔ اگر کوئی درخت پانی نہ ملنے کی وجہ سے سوکھ رہا ہو تو وہ بھی محروم ہے، اور اس کو پانی پہنچانا اہل ایمان کی ذمہ داری ہے۔

ایمان جب کسی آدمی کے دل میں جگہ پاتا ہے تو اس کے اندر خدمتِ عام کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ نہ صرف سائل کی ضرورت پوری کرنے کو اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے، بلکہ اس کا احساس یہ ہو جاتا ہے کہ ہر محروم کا اس کے اوپر حق ہے، خواہ وہ انسان ہو یا جانور یا کوئی درخت۔

اسلام آدمی کو انتہائی سنجیدہ اور انتہائی حساس بنا دیتا ہے۔ ایسا آدمی سارے لوگوں کو اپنا سمجھنے لگتا ہے، وہ جان لیتا ہے کہ اس کا مال خدا کا عطیہ ہے۔ اس کا یہ احساس اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ اس کو خدا کی راہ میں خرچ کرے۔

رحمت اور سیف

قرآن میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمۃ للعالمین (الانبیاء ۱۰۷) کہا گیا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ انا محمد ۔۔۔ ونبی الرحمۃ (صحیح مسلم بشرح النووی ۱۵/ ۱۰۵)

ایک طرف پیغمبر اسلام کی حیثیت کے بارہ میں اس قسم کے کھلے بیانات ہیں۔ دوسری طرف حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میرا رزق میرے نیزہ کے سایہ کے نیچے رکھا گیا ہے (جُعل رِزقی تحتَ ظِلِّ رُمحی) ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا: بُعثت بین یدی الساعۃ مع السیف۔ یعنی میں قیامت سے پہلے تلوار کے ساتھ بھیجا گیا ہوں (فتح الباری بشرح صحیح البخاری ۶/ ۱۱۵ – ۱۱۶)

یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے مختلف نظر آتی ہیں۔ مگر ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہ درحقیقت دو الگ الگ پہلو ہیں۔ رحمت کی بات ایک پہلو سے کہی ہے اور سیف کی بات دوسرے پہلو سے۔

اصل یہ ہے کہ صرف پیغمبر اسلامؐ ہی رحمت کے پیغمبر نہ تھے۔ بلکہ خدا نے جتنے پیغمبر بھیجے وہ سب پیغمبر رحمت ہی تھے۔ سب کے سب دینِ رحمت ہی لے کر آئے۔ مثال کے طور پر قرآن میں حضرت موسیٰؑ کی کتاب کو رحمت فرمایا گیا ہے (ہود ۱۷) مگر فرق یہ ہے کہ پچھلے پیغمبروں کے ساتھ کوئی طاقت ور ٹیم تیار نہ ہو سکی جو پیغمبروں کے مشن کے حق میں موثر طور پر حمایت اور دفاع کا کام کر سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پچھلے پیغمبروں کے مشن کو مخالفین نے عملی طور پر آگے بڑھنے نہیں دیا۔ پچھلے پیغمبروں کے زمانہ میں خدا کا دین صرف فکری تحریک کے مرحلہ میں رہا، وہ فکری انقلاب کے مرحلہ تک نہیں پہنچا۔

اس کے برعکس پیغمبر اسلام کو خدا کی مدد سے "اصحاب سیف" بالفاظ دیگر، طاقت ور حمایتی گروہ حاصل ہو گیا۔ چنانچہ مخالفین نے جب جارحیت کر کے آپ کے پر امن مشن کو دبانا اور مٹانا چاہا تو آپ بھی اپنے ساتھیوں کی مدد سے اس پوزیشن میں تھے کہ ان کی جارحیت کا موثر جواب دے کر ان کے مخالفانہ عزائم کو ناکام بنا دیں۔

مذکورہ قسم کی احادیث میں نیزہ اور تلوار کا لفظ آپ کی دفاعی طاقت کو بتانے کے لیے ہے نہ کہ آپؐ کی اصل پیغمبرانہ حیثیت کو بتانے کے لیے۔

جنگ کا حکم

وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین (البقرہ ۱۹۰)

اور اللہ کے راستہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور زیادتی نہ کرو۔ بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اعتداء کے معنی ہیں زیادتی کرنا، تجاوز کرنا۔ یہاں یہ لفظ جارحیت (aggression) کے معنی میں ہے۔ الراغب الاصفہانی نے یہاں اس کو جارحیت کے آغاز (الاعتداء علی سبیل الابتداء) کے معنی میں لیا ہے (المفردات فی غریب القرآن ۳۲۷)

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایہا الناس، لا تتمنّوا لقاءَ العدوّ وسَلوُا اللہ العافیۃَ۔ یعنی تم لوگ دشمن سے مڈبھیڑ کی تمنا نہ کرو۔ اور اللہ سے عافیت مانگو (فتح الباری بشرح صحیح البخاری ۱۴۰/۶)

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام مکمل طور پر امن کا مذہب ہے۔ اسلام میں امن کی حیثیت حکم عام کی ہے اور جنگ کی حیثیت صرف استثنائی۔ یہ استثنائی حکم اس وقت کے لیے ہے جب کہ کسی نے یک طرفہ طور پر جنگ کا آغاز کر دیا ہو۔ اس وقت دفاع کے طور پر جنگ کی جائے۔ مگر خود سے جنگ چھیڑنے کی اجازت اسلام میں نہیں۔

تاہم یہ دفاع بھی ایک ضروری شرط کے ساتھ مشروط ہے، اور وہ اعراض ہے۔ سنت رسولؐ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فریق ثانی اگر جنگ کے حالات پیدا کرے تب بھی ابتدائی کوشش اسی کی ہوگی کہ عملی طور پر جنگ کی نوبت نہ آئے۔ لیکن اگر ایسا ہو کہ جنگ سے بچنے کی ہر کوشش ناکام ہو جائے اور فریق ثانی کی طرف سے جنگ کا عملی آغاز کر دیا جائے تو اس وقت آخری چارۂ کار کے طور پر جنگ کی جائے گی۔

اسلام ملک گیری کا مذہب نہیں۔ وہ مکمل طور پر ایک دعوتی مذہب ہے۔ اور دعوت کا کام ہمیشہ امن چاہتا ہے، جنگ کا ماحول دعوتی کام کے لیے ہرگز مناسب نہیں۔ امن میں دعوت کو فروغ حاصل ہوتا ہے اور جنگ میں دعوت کا کام معطل ہو جاتا ہے۔

بین اقوامی رواج

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری زمانہ میں عرب کے دو آدمیوں نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ ایک یمامہ کا مسیلمہ بن حبیب، اور دوسرا صنعاء کا اسود بن کعب عنسی۔ مسیلمہ نے ۱۰ھ میں ایک خط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا۔ اس خط کا مضمون یہ تھا: اللہ کے رسول مسیلمہ کی جانب سے اللہ کے رسول محمدؐ کے نام، سلام علیک، امابعد، بے شک میں نبوت کے معاملہ میں آپ کے ساتھ شریک کیا گیا ہوں، اس لیے نصف زمین ہمارے لیے اور نصف زمین قریش کے لیے۔ مسیلمہ کی طرف سے دو قاصد اس کا یہ خط لے کر مدینہ آئے۔ ان کا نام ابن النواحہ اور ابن اُثال تھا۔ اس کے بعد روایت میں آتا ہے:

قال سمعت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم حین جاءہ رسولا مسیلمۃ الکذاب بکتابہ یقول لھما: وانتما تقولان مثل مایقول۔ قالا نعم۔ فقال اَما واللہ لولا اَن الرُسل لا تُقتل لضربتُ اعناقکما۔

راوی کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا جب کہ مسیلمہ کذاب کے دونوں قاصد اس کا خط لے کر آئے، کیا تم دونوں بھی وہی کہتے ہو جو وہ کہتا ہے۔ دونوں نے کہا کہ ہاں۔ آپ نے فرمایا کہ خدا کی قسم، اگر یہ بات نہ ہوتی کہ قاصدوں کو قتل نہیں کیا جاتا تو میں تم دونوں کی گردنیں کٹوا دیتا۔

راوی حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ: فمضت السنۃ بان الرسل لا تقتل۔ یعنی پھر یہ سنت جاری ہو گئی کہ قاصدوں کو قتل نہ کیا جائے (البدایہ والنہایہ ۵/۵۱-۵۲)

اس سنت نبوی سے اسلام کا ایک نہایت اہم اصول معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ بین اقوامی معاملات میں بین اقوامی رواج پر عمل کیا جائے گا۔ ہر زمانہ میں بین اقوامی تعلقات کے لیے کچھ رواج ہوتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں بھی اس قسم کے بہت سے رواج ہیں۔ اب اقوام متحدہ نے ان کو زیادہ منظم صورت دے دی ہے۔ اس قسم کے تمام رواج مسلم ملکوں میں بھی اسی طرح قابل احترام ہوں گے جس طرح غیر مسلم ملکوں میں ان کو قابل احترام سمجھا جاتا ہے۔ البتہ اگر اس قسم کے معاملات میں کوئی ایسی چیز رواج پا جائے جو صراحتہً حرام ہو۔ مثلاً بین اقوامی میٹنگوں میں شراب پیش کرنا، تو اس مخصوص جزء کی حد تک اس کی پیروی نہیں کی جائے گی۔

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اُردو

	Rs.
تذکیر القرآن جلد اول	200/-
تذکیر القرآن جلد دوم	200/-
اللہ اکبر	45/-
پیغمبر انقلاب	40/-
مذہب اور جدید چیلنج	45/-
عظمتِ قرآن	50/-
عظمتِ اسلام	50/-
عظمتِ صحابہ	7/-
دینِ کامل	50/-
الاسلام	40/-
ظہورِ اسلام	70/-
اسلامی زندگی	25/-
احیاءِ اسلام	40/-
رازِ حیات	50/-
صراطِ مستقیم	40/-
خاتون اسلام	50/-
سوشلزم اور اسلام	70/-
اسلام اور عصرِ حاضر	50/-
الربانیہ	40/-
کاروانِ ملت	45/-
حقیقتِ حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دورِ جدید کا خالق	25/-
حدیثِ رسولؐ	35/-
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	85/-
سفرنامہ (ملکی اسفار)	–
میوات کا سفر	35/-
قیادت نامہ	–
راہِ عمل	25/-
تعبیر کی غلطی	95/-
دین کی سیاسی تعبیر	20/-
امہات المومنین	20/-
عظمتِ مومن	7/-
اسلام ایک عظیم جدوجہد	3/-

تاریخ دعوتِ حق	5/-
مطالعۂ سیرت	12/-
ڈائری جلد اول	100/-
کتابِ زندگی	55/-
انوارِ حکمت	–
اقوالِ حکمت	25/-
تعمیر کی طرف	8/-
تبلیغی تحریک	20/-
تجدیدِ دین	35/-
عقلیاتِ اسلام	50/-
مذہب اور سائنس	–
قرآن کا مطلوب انسان	8/-
دین کیا ہے	5/-
اسلام دینِ فطرت	7/-
تعمیرِ ملت	7/-
تاریخ کا سبق	7/-
فسادات کا مسئلہ	5/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	8/-
تعارفِ اسلام	5/-
اسلام پندرھویں صدی میں	10/-
راہیں بند نہیں	12/-
ایمانی طاقت	7/-
اتحادِ ملت	7/-
سبق آموز واقعات	7/-
زلزلۂ قیامت	20/-
حقیقت کی تلاش	12/-
پیغمبرِ اسلام	5/-
آخری سفر	7/-
اسلامی دعوت	7/-
خدا اور انسان	12/-
حل یہاں ہے	10/-
سچا راستہ	8/-
دینی تعلیم	12/-
حیاتِ طیبہ	7/-
باغِ جنت	7/-

نارِ جہنم	7/-
خلیج ڈائری	10/-
رہنمائے حیات	7/-
مضامینِ اسلام	45/-
تعددِ ازواج	10/-
ہندستانی مسلمان	40/-
روشن مستقبل	7/-
صومِ رمضان	12/-
علمِ کلام	9/-
اسلام کا تعارف	2/-
علماء اور دورِ جدید	8/-
سیرتِ رسولؐ	10/-
ہندستان آزادی کے بعد	1/-
مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	7/-
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	4/-
منزل کی طرف	2/-
الاسلام یتحدیٰ (عربی)	85/-

ھندی

سچائی کی تلاش	8/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	4/-
پیغمبرِ اسلامؐ	4/-
سچائی کی کھوج	10/-
آخری سفر	8/-
اسلام کا پریچے	8/-
پیغمبرِ اسلام کے مہان ساتھی	8/-
راستے بند نہیں	7/-
جنت کا باغ	8/-
بہو پتنی واد اور اسلام	10/-
اتہاس کا سبق	9/-
اسلام ایک سوابھاوک مذہب	8/-
اجول بھویش	8/-
پوتر جیون	8/-
منزل کی اور	3/-

English

God Arises	Rs. 95/-
Muhammad: The Prophet of Revolution	85/-
Islam As It Is	55/-
God-Oriented Life	70/-
Religion and Science	45/-
Indian Muslims	65/-
The Way to Find God	-
The Teachings of Islam	-
The Good Life	-
The Garden of Paradise	-
The Fire of Hell	-
Man Know Thyself!	8/-
Muhammad: The Ideal Character	5/-
Tabligh Movement	25/-
Polygamy and Islam	10/-
Words of the Prophet	75/-
Islam: The Voice of Human Nature	30/-
Islam: Creator of the Modern Age	55/-
Woman Between Islam and Western Society	95/-
Woman in Islamic Shari'ah	65/-
Hijab in Islam	20/-

آڈیو کیسٹ

آڈیو کیسٹ	Rs.
حقیقتِ ایمان	25/-
حقیقتِ نماز	25/-
حقیقتِ روزہ	25/-
حقیقتِ زکوٰۃ	25/-
حقیقتِ حج	25/-
سنتِ رسولؐ	25/-
میدانِ عمل	25/-
رسول اللہؐ کا طریق کار	25/-
اسلامی دعوت کے جدید امکانات	25/-
اسلامی اخلاق	25/-
اتحادِ ملت	25/-
تعمیرِ ملت	25/-
نصیحتِ لقمان	25/-

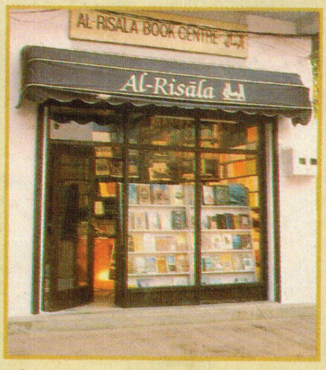
AL-RISALA BOOK CENTRE
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013, Tel. 4611128, Fax 4697333

Comprehensive Range of Books on Islam and the Muslim History









AL-RISALA BOOK CENTRE
1, Nizamuddin West Market, Near DESU, New Delhi-110 013
Tel. 4611128 Fax 4697333

RNI 2882/76 • U(SE) 12/96
Delhi Postal Regd. No. DL/11154/96